شہرِ خواب



حسین سحر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہرِ خواب

(غزلیں)

حسین سحر

سحر سنز.................ملتان/لاہور

ضابطہ

اشاعت اوّل:.................. 2009

اہتمام:.................................الکتاب گرافکس پل شوالہ ملتان

ناشر:.................................سحر سنز لاہور/ملتان

قیمت:.................................-/400 روپے

بیرونِ ملک:........................ 25 درہم، 15 یو ایس ڈالر

ملنے کا پتہ

کتاب نگر......حسن آرکیڈ ملتان چھاؤنی

ابو میمون اللہ بخش نے عاتکہ پرنٹرز سے چھپوا کر الکتاب گرافکس ملتان سے شائع کی۔

ISBN 978-969-9337-08-6

انتساب

اپنے پیارے بیٹوں

شہزاد سحر اور مہزاد سحر

کے نام

آئینہ

غزلیں

''شہرِ خواب'' پر تاثرات

حسین سحر ایک شخصیت کا نام ہے لیکن یہ شخصیت اپنی جگہ ایک ''ادارہ'' ہے۔ اُنہوں نے تنہا اتنا کام، اتنا کام کیا ہے کہ بے شمار لوگ بھی اتنا کام نہیں کر سکتے۔ لوگ انہیں جانتے ہی نہیں بلکہ مانتے بھی ہیں وہ بلا مبالغہ ایک ادبی اور علمی محسن ہیں۔ جس جہت پر نظر ڈالئے اُن کے تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی نام کی گرفت میں ہے۔ میں جو بالاختصار اُن کے کام کا جائزہ لوں گا۔ کسی کی معلومات میں اضافہ نہیں کروں گا۔ لوگ یہ باتیں پہلے بھی جانتے ہیں۔ میں صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر چند تعارفی سطور لکھوں گا۔ مثلاً انہوں نے بچوں کا ادب لکھا اور اتنا وقیع انداز میں لکھا کہ وہ بچوں کا ادب لکھنے والے علماء ادبا اور شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے حمد و نعت، سلام، منقبت، غزل اور نظم اور دوسری ادبی و شعری اصناف میں جو لکھا لوگ اس سے تحصیلِ علم و ادب کرتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۱ء کے بعد خطۂ ملتان میں شعر و ادب کے فروغ میں جو کارنامے سرانجام دیئے اُن کے سبب ملتان کی دیرینہ ادبی و شعری روایت میں جدید اضافے ہوئے۔

انہوں نے 'مکتبۂ اہلِ قلم' قائم کیا اور اس قابلِ قدر طباعتی و اشاعتی ادارے سے بہت سے اہلِ قلم کی تصانیف شائع کیں۔ انہوں نے 'مجلسِ اہلِ قلم' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس کی افادیت اپنی جگہ ہے۔ انہوں نے تراجم کا کام کیا جس میں اُن کا ایک بے مثال اور منفرد کارنامہ قرآن مجید کا منظوم اردو ترجمہ ہے جس کا نام ''فرقانِ عظیم'' ہے۔ اس ترجمے کی اہمیت، افادیت اور جامعیت کو انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے جو اس سے پہلے منظوم ترجمے کر چکے تھے۔ حال ہی میں انہوں نے ''پھلکاری'' کے نام سے منتخب پنجابی اور سرائیکی ادب کے اردو تراجم شائع کیے ہیں جو اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے بھی اور ترجمے کی خصوصیات کے اعتبار سے بھی لائقِ تحسین ہیں۔ یہ ایک طرح سے دوسری پاکستانی زبانوں کے ادب کو اردو دان سے متعارف کرانے اور ان سے استفادے کی

صورت میں اردو زبان کو وسعت دینے اور آپس میں محبت ویگانگت پھیلانے کا ایک وسیلہ ہے۔ان تراجم کو پڑھ کر اردو زبان کے ادیب اس قابلِ قدر سرمائے سے فیضیاب ہوں گے اور پاکستان کے ادب وثقافت کے گلدستے میں اپنے تخلیقی لالہ وگل کا اضافہ کریں گے۔اس طرح حسین سحر نے خالد الفیصل کی عربی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔یہ وحدتِ اسلامیاں کے سلسلے میں ایک علمی وادبی قدم ہے۔حسین سحر اسلامی ممالک میں بھی گئے اور وہاں اپنے ادب کی ترویج وفروغ میں کوشاں رہے۔

حسین سحر کا قلم تیزی سے رواں دواں ہے اور اُن کے ذہن وقلب کی واردات اور اُن کے افکار کی کیفیات کو حوالۂ قرطاس کر رہا ہے اور یوں علمی وادبی خزائن کے انبار لگتے جا رہے ہیں۔

میرے روبرو اُن کی غزلیات کا مسودہ ہے جس کا نام ''شہرِ خواب'' ہے۔اُن کا اصرار ہے کہ میں اپنے تاثرات لکھوں۔میں نے ان سے عرض کی کہ آپ عظمت،شہرت اور مقبولیت کے اُس مرتبۂ بلند پر فائز ہیں کہ آپ پر کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔لیکن اُن کا اصرار جب حکم کی شکل اختیار کر گیا تو میں نے اور میرے قلم نے سرِ تسلیم خم کر لیا۔اگر میرے تاثرات اس کتاب میں شامل ہوتے ہیں تو یہ حسین سحر کا نہیں،خود میرا اعزاز ہے۔جب کوئی کتاب میرے سامنے آتی ہے تو سب سے پہلے میں اُس کا نام دیکھتا ہوں۔اس نام نے یعنی ''شہرِ خواب'' نے مجھ پر سوچ کے دروازے کھول دیئے۔اس نام میں کتنی رمزیت،اشاریت اور پُراسراریت ہے۔ذرا غور کیجئے۔شہرِ خواب شاعر کا وجود بھی ہوسکتا ہے۔شاعر بہت سے خواب دیکھتا ہے۔اُس کی شاعری خود خوابوں کا ایک تسلسل ہے۔شہرِ خواب وہ بستی یا وہ خطہ یا وہ ملک بھی ہوسکتا ہے جہاں کے باشندے خواب دیکھنے میں مگن ہیں۔حالانکہ جب ہم عہدِ غلامی میں تھے اور سو رہے تھے،تب ہم جاگے اور ہم نے تحریک آزادی کا آغاز کیا اور پاکستان کو تشکیل دے کر ہم نے خواب کو تعبیر میں بدل دیا۔بہرحال خواب میں اشاریت یہ ہے کہ وہ تعبیر کی شکل اختیار کرتا ہے۔اس لئے شہرِ خواب کا شاعر چاہتا ہے کہ اُس کے خواب تعبیر کا پیکر اختیار کریں۔گویا اس نام میں رجائیت کا پہلو ہے کہ ہم یاسیت کے مقامات طے کرتے ہوئے منزلِ تعبیر پر اقامت کریں۔مجھے اس نام نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور میں

نہایت محویت،استغراق،شعور اور وجدان کے ساتھ ان غزلیات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

حسین سحر بحیثیت ایک دانشور یا صاحبِ قلم یا ادیب یا شاعر روایت کی پاسداری کرتے ہیں لیکن روایت سے صرف اس کا عطر نچوڑتے ہیں۔روایت کے صرف اُن عناصر سے رابطہ رکھتے ہیں جو زندہ ہیں اور ان کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہمارے عہد تک پہنچے ہیں اور قابلِ قبول ہیں اس عطرِ روایت یا حسنِ روایت یا انتخابِ روایت میں حسین سحر عصرِ گزراں یعنی اپنے عہد کا جمال شامل کر دیتے ہیں۔لسانی،فنی،اسلوبیاتی اعتبار سے آج کی زبان اور آج کے قواعد کی پاسداری کرتے ہیں اور اس طرح افکار وخیالات اور مشاہدات وتناظرات آج کے دور سے اخذ کر کے اپنی غزلوں میں جذب کرتے ہیں۔اس لئے ہم حسین سحر کی شاعری کو آج کی شاعری کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ایسی شاعری جس میں اتنی استقامت ہے کہ وہ عہدِ آئندہ میں بھی اثر انداز رہے گی۔

حسین سحر کی ان غزلوں کے اشعار میں کہیں اعادہ وتکرار نہیں بالکل ہر جگہ نئے مضمون کی تازگی ہمیں شاداب کرتی ہے۔مضامین کا یہ تنوع اُن کی غزلوں کو پُرکشش بناتا ہے اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے باغ کی سیر کر رہے ہیں جہاں رنگ برنگ اور متنوع پھولوں کی کیاریاں جلوہ نما ہیں۔آج کے جو احوال ومسائل ہوسکتے ہیں وہ تمام کے تمام اُن کی غزلوں میں موجود ہیں۔انسان کی ذاتی زندگی،حیاتِ اجتماعی کا جائزہ،ملک وملت کے احوال وکیفیات،عالمی وقوعات ومعاملات سب اُن کی غزلوں میں جلوہ نما ہیں۔پھر وہ اُس نظریۂ ادب کے قائل ہیں جس میں ادب محض سامانِ تفریح نہیں بلکہ اپنے اندر ایک مقصدیت رکھتا ہے۔ادب حالات کا آئینہ دار ہی نہیں بلکہ حالات کے چہرے اور خط وخال کے حسن میں اضافے کا ذمہ دار بھی ہے۔ادب مسافرانِ ہستی کی منظر نگاری ہی نہیں کرتا بلکہ اُن کی راہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔اس نظریۂ ادب نے حسین سحر کی غزلوں کو پُر از مقاصد،مفید اور اثر پذیر بنا دیا ہے۔

ہمارے یہاں غزل میں یاس وحرماں کا بہت سا ذخیرہ ہے۔حسین سحر کے شعروں میں بھی اگرچہ یاسیت موجود ہے لیکن وہ یاسیت پر قائم نہیں رہتے بلکہ یاسیت کو یقین،امید اور رجائیت

کی منزل پر لے آتے ہیں۔ اس امید افزائی نے بھی ان کی غزلوں کو ہمارے لئے نہایت با معنی ،نہایت پر کشش ،نہایت دلکش ،دلنشیں اور دلکشا بنادیا ہے، **الغرض** جس پہلو سے بھی دیکھیں، چاہے فنی جائزہ لیں، چاہے معنوی تجزیہ کریں،شہرِ خواب کی غزلیں ہم سب کے لئے متاعِ افتخار ہیں ،ہم انہیں پڑھتے ہیں اوران کے مطالعے سے خودکوسنوارتے اورنکھارتے اور بہتر سے بہترین بناتے ہیں۔

شاعری میں ،میری مراد ہے، اچھی اور معیاری شاعری میں ایک سلیقہ مندی، ایک شائستگی اور ایک تہذیب ہوتی ہے۔ حسین سحر نے اپنے تمام شعروں کو یہ تہذیبی پوشاک عطا کی ہے۔ اُن کے یہاں عشق و رومان کی شاعری میں بھی شائستہ اندازِ فکر و بیاں ملے گا۔ کہیں سستی جذباتیت اور ہوس انگیز خیالات نظر نہیں آئیں گے۔ عشقِ مجازی کے کوچۂ ملامت سے سلامت روی کے ساتھ گزر جانا حسین سحر کی تہذیب داری کی ایک لائقِ تحسین مثال ہے۔

حسین سحر کے یہاں طرزِ بیان کی یہ خوبی ہے کہ وہ سادہ و سلیس اشعار کہتے ہیں لیکن اس سادگی اور سلاست کا ایک ادبی جمال ہے۔ ان کے یہاں ایک لفظ بھی ایسا مشکل نہ ملے گا جس کے لئے قاری کو لُغت دیکھنا پڑے۔ یہ سلاست اُن کی شاعری میں ابلاغ کی ضامن ہے۔ قاری نے شعر پڑھا اور وہ شعر از دل خیزد بر دل ریزد کے طور پر قاری کے ذہن و دل کا حصہ بن گیا۔ حسین سحر مضامین کے تنوع کے لئے **بالعموم** نئی ردیفیں ایجاد کرتے ہیں اور اُن ردیفوں کا ارتباط متناسب قوافی سے کرتے ہیں۔ اُن کا یہ عمل اُس کی غزلوں میں جان ڈالتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

راہیں باتیں کرتی ہیں، زلفیں باتیں کرتی ہیں، کب اُس کی طرف ،سب اُس کی طرف، نشان بھول گئے ،آسمان بھول گئے ،پوشاک سلامت رہ جائے، چاک سلامت رہ جائے، جادو جاگتے ہیں، آنسو جاگتے ہیں، تیرگی کا لمس، روشنی کا لمس، بام و در سے وابستہ ،گھر سے وابستہ، لہو کا ذائقہ، آرزو کا ذائقہ، **حالات کی آغوش میں**، آفات کی آغوش میں، دیا ہے شام کی دہلیز پر، ضیا ہے شام کی دہلیز پر، بدن اوڑھے ہوئے، چمن اوڑھے ہوئے، عہدِ خزاں مٹھی میں ہے، آسماں مٹھی میں ہے، ہزاروں کا پیرہن، اشاروں کا پیرہن، (اور بے شمار)

اسی طرح حسین سحر بعض نئی تراکیبِ لفظی لاتے ہیں۔ اس سے اُن کے ذوقِ ایجاد کا اندازہ ہوتا

ہے۔ مثلاً: طاقِ شفق کی گود، ردائے کرب، خنجرِ گرداب، خوشبو کے دھارے، وجود کی کرچیاں، گنبدِ احساس، درد کی بھٹی، سحابِ حرماں (اور بے شمار)

عشقیہ اور رومانی شاعری: جیسا کہ اوپر درج ہوا ایسے تمام افکار و خیالات میں ایک متانت ،سلیقہ شعاری اور تہذیبِ عشق شامل ہے۔ حسین سحر حالتِ فراق میں رہتے ہیں لیکن وصل و قرب کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اکثر یادوں کی فضا میں زندگی گزارتے ہیں۔ حُسنِ محبوب کی منظر کشی بے حد شائستگی سے کرتے ہیں۔ جسمانیت کا تذکرہ نہیں۔ زیادہ تر چہرۂ محبوب کی خوبصورتی کو اُجاگر کرتے ہیں۔ قاری اُن کے رومانی اشعار کو تقدس کی فضا میں پڑھتا ہے بلکہ اپنے جذبات میں سلیقہ پیدا کرتا ہے۔ چند اشعار:

نگاہیں دیکھنے والی اگر ہوں
تری آنکھوں میں جادو جاگتے ہیں

☆

میں نے کبھی چھوا تھا کسی رشکِ ماہ کو
ہاتھوں میں اب تلک ہے مرے چاندنی کا لمس

☆

اُس کے ہونٹوں پر تبسم اس طرح ہے جلوہ ریز
برگِ گل جیسے ستاروں کی کرن اوڑھے ہوئے

☆

ایک رشکِ مہر ومہ پہلو میں ہے میرے سحر
ایسے لگتا ہے کہ جیسے کہکشاں مٹھی میں ہے

☆

خوشبو کسی کی یاد کی چھو کر گزر گئی
اور مجھ کو دے گئی ہے نئی زندگی کا لمس

یاسیت کا ذکر اور رجائیت کی جانب میلان: اس موضوع کے حوالے سے شاعر اپنے وطن کا

دُکھ، اپنے معاشرے کا کرب اور حیاتِ ذاتی و اجتماعی کا الم بیان کرتا ہے لیکن رجائیت کی نوید سے یاسیت کا ازالہ کر دیتا ہے: مثلاً

سن کر جسے شاخوں پہ چٹک اُٹھتی ہیں کلیاں
بچوں کے لبوں پر وہ ہنسی کیوں نہیں آتی

☆

نئی فضا میں نیا خوف تھا پرندوں کو
پروں کے ہوتے ہوئے بھی اڑان بھول گئے

☆

حد سے گزر چکی ہے شبِ غم کی تیرگی
سورج کو اب سروں پہ چمک جانا چاہیے

☆

چاند ، چراغ ، ستارے جگنو میرے ہیں
تاریکی سے لڑتے بازو میرے ہیں

☆

اگر ہو واقعی موجود جذبۂ صادق
چراغ تیز ہواؤں میں جل بھی سکتے ہیں

☆

اک دیا بجھنے کو ہے طاقِ شفق کی گود میں
اک دیا جلنے لگا ہے شام کی دہلیز پر

☆

حالات کو اک رنگ میں رہنا نہیں آتا
اس زلفِ پریشاں کو سنورنا ہے کسی دن

چلے چلو اسی رستے پہ قافلے والو
دکھائی دیتی ہے منزل غبار سے آگے

نفرت سے گریز اور محبت کا درس: یہ بہت اہم موضوع ہے۔شاعری کا اصل مقصود یہی ہونا چاہئے کہ ہم نفرتوں کو ختم کریں اور وسیع محبت کا پیغام دیں۔کیونکہ انسانوں کے مابین محبت، امن اور سلامتی کی بہشت کو ارضِ بشر پر تعمیر کرتی ہے: اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

ظلم اور نفرت سے میرا کیا سحرؔ رشتہ
امن اور محبت کے سارے خواب میرے ہیں

☆

میرا بس ہو تو کسی کو بھی نہ روتا دیکھوں
پی ہی جاؤں میں دکھوں کی یہ نمی آنکھوں سے

☆

سحرؔ قبیلۂ اہلِ محبت ہے میرا
سچل اور رحمٰن اور باہو میرے ہیں

☆

جس کی بنیاد پہ نفرت کا نہ سایہ جائے
شہر اک ایسا محبت کا بسایا جائے

ایک حقیقی فنکار کا تعارف اور اُس کی ذمہ داریوں کے فرائض کا تعین نیز اُس کو صداقت اور بے باکی کے ساتھ اظہارِ خیال کی ضرورت:

ایک فنکار جو درس معاشرے کو دینا چاہتا ہے پہلے اُسے اپنے آپ کو اُس درس میں ڈھالنا چاہئے۔ذات اور فن میں تضاد، اُس کی بات کو بے اثر کر دیتا ہے جبکہ شخصیت و فن میں ہم رنگی وہم آہنگی اُس کی ہر بات میں اثر پیدا کرتی ہے۔یہ بہت اہم موضوع ہے، اس پر حسین سحرؔ کے انمول اور قابلِ قدر اشعار ملاحظہ کیجئے:

فقط حُسنِ سخن ہی باعثِ توقیر انساں ہے
صدف کی ساری قیمت ہے سحر گوہر سے وابستہ

☆

گر چہ چھن جائے دہن سے یہ زباں میری سحر
اِک مرا لہجۂ بے باک سلامت رہ جائے

☆

عکس ہے مجھ میں یہ سب آئینۂ حالات کا
اِک ردائے کرب ہے جو میرا فن اوڑھے ہوئے

☆

کب زر و لعل و گہر باندھ رکھے ہیں ہم نے
جیب میں حرفِ ہنر باندھ رکھے ہیں ہم نے

☆

لکھا نہیں قصیدہ کسی بادشاہ کا
ہم نے قلم کی روح کو مرنے نہیں دیا

بھائی حسین سحر! نہایت عجز کے ساتھ میں نے اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ میں آپ کے علم و فضل کا ذرا بھی حق ادا نہیں کرسکا۔ اگر میرے یہ تاثرات آپ "شہرِ خواب" میں شامل فرمالیں تو میں سمجھوں گا کہ یہ میرا اعزاز ہے۔

خدا آپ کو سلامت رکھے اور آپ اپنے گنجینۂ شعر و ادب میں نئے نئے لعل و گہر کا اضافہ فرماتے رہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی
ملتان

حُسین سحر۔۔۔وسیع کینوس کا شاعر

حسین سحر وسیع کینوس اور آفاقی تصور کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اپنے موضوعات، معانی، مطلوب اہداف اور جمال کے اعتبار سے اپنے معاصر ادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ شاعری کو آفاق کی ہم نوائی عطا کرتے ہیں اور اسے ایسا اسلوب گویائی عطا کرتے ہیں جو واقعات اور موضوعات کے پس پردہ بھی اپنی ترسیل جاری رکھ سکے۔ وہ منطقی اور فکری تعبیرات کو اپنے مخصوص فکری نہج میں ڈھال لیتے ہیں۔ شعر گوئی کا یہ اسلوب اپنے افکار میں بہت موثر اور ممتاز ہے۔

اردو شاعری میں پے در پے تجربوں اور تبدیلیوں نے اس کے مزاج کو مختلف معنوں میں متاثر کیا اور رفتہ رفتہ یہ عام تاثر قائم ہوتا گیا کہ بحیثیت شعریات اردو شاعری کا کوئی مخصوص اور متعین مزاج نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ مزاج کی ترتیب اور تہذیب خود شاعر کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ اس سے شاعری یعنی شعریات کا بلا آخر وہی مزاج تیار ہوتا ہے جو کسی شاعر کا اپنا مزاج ہو۔ اس لئے الفاظ اور نظریات بدل بدل کر اردو شاعری کے مزاج کے رخ کو گاہے بگاہے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ہمیشہ یہ فراموش کیا گیا ہے کہ اردو شاعری کی اپنی الگ فطرت ہے جو اپنی پیدائش ہی سے نیکی، محبت، خلوص، وفا، درد، ذوق، جمال، ایثار اور احسان جیسے اخلاق سے آراستہ رہی ہے۔ یہی اردو شاعری کی خشتِ اوّل ہے۔

اردو شاعری خواہ کسی حد تک ترقی کر جائے اور اس میں کیسی بھی جدت پیدا ہو جائے مگر یہ اپنی خشتِ اول کی وجہ سے جس کی بنیاد صوفیائے کرام نے رکھی تھی آج بھی محبت، نیکی، وفا، خلوص، درد، ذوق، جمال، ایثار اور احسان جیسے اخلاق وقتاً فوقتاً ظاہر کرتی رہی ہے۔ یہ اردو شاعری کی وہ آفاقی تہذیب ہے جس پر مختلف نظریات، رجحانات، افکار اور مسائل کی گرد پڑتی رہی ہے زمانے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ ایسا بھی ہوا ہے کہ اردو میں کوئی حالی پیدا ہو گیا ہے جس نے شاعری سے اخلاق اور جذبات کی تعمیر کا کام لیا ہے اور اس کی بنیادی پہچان کو از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ زمانے کے اسی تغیر نے کسی اقبال کو پیدا کیا ہے جس نے اردو شاعری کو روح حیات اور آفاقیت کا جامہ پہنایا ہے اور اردو شاعری کی بنیاد میں جو مزاج رکھا گیا تھا اس کی ایسی آفاقی توجیہہ سامنے لائی ہے کہ اس کی

وجہ سے پوری اردو شاعری کا معیار اور وقار بلند ہوا ہے۔

علامہ اقبال نے اردو شاعری کے کینوس کو اس قدر پھیلایا کہ اردو شاعری انسانی جذبات اور احساسات کے اظہار کے ساتھ فطرت اور کائنات سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی خدا سے جا ملی۔ اقبال نے معرفت اور حقیقت کے وہ مقام بیان کئے جن کے اظہار سے اردو شاعری قاصر تھی۔ علامہ اقبال نے بیسویں صدی کے اجتماعی لاشعور کو از حد متاثر کیا۔ ان کا اثر بہت سی نسلوں پر رہا اور آج بھی جاری ہے' حتیٰ کہ ترقی پسند تحریک کے بعض علم برداروں پر بھی اقبال کا اثر رہا۔ خود فیض احمد فیض کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ترقی پسند ہونے کے باوجود جزوی طور پر شعری صوتیاتی آہنگ اور لہجہ کی بالیدگی میں اقبال سے ملتے ہیں۔ اسی طرح جوش' جگر اور حفیظ جالندھری پر بھی یہ اثرات نمایاں رہے۔ پھر ان شعراء کا اپنا مزاج بھی ان کے شعری Diction کی تشکیل میں برابر کا حصہ دار رہا۔ ذرا بعد میں علامہ جمیل مظہری کا بھی نام لیا گیا' کہ ان پر بھی اقبال کا اثر رہا بلکہ اقبال کی روایت کو انہوں نے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ خودی کا فلسفہ ہو یا ہستی کے دوسرے مسائل' ان کے یہاں بھی جزوی طور پر اقبال کا آہنگ ہوتا ہے۔ علامہ جمیل مظہری کا یہ شعر اقبال کی پیروی کرتا ہے ۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

تاہم بعض ناقدین نے جمیل مظہری کو تشکیک کا شکار ثابت کر کے ان کے اس پہلو کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدید اردو شاعری میں بھی آپ دیکھیں تو بہت سے ایسے شعراء ملیں گے' جن کے ہاں لب ولہجہ اور ہیئت و اسلوب میں جدت کے باوجود ایسی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جو اقبال کی طرح پر شکوہ آہنگ کی ضامن ہو۔ اس ضمن میں جدید اردو کا ہر بڑا شاعر مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال ہماری آرکی ٹائپ کا حصہ بن چکے ہیں۔ احمد فراز کا یہ مشہور زمانہ شعر دیکھئے ۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

اس شعر کی صوتیات میں اقبال کے ابتدائی دور کا آہنگ صاف نمایاں ہے۔

حسین سحر کی شاعری کے سلسلے میں عرض کرنا ہے کہ حسین سحر بھی دورِ جدید کے ان باوقار

اور معیاری شعراء کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے اسلوب و ادا اور لب ولہجہ سے پورے طور پر جدید بلکہ جدید تر شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے موضوع منصب اور تمثیل کے اعتبار سے جدید اردو شاعری میں ایک وسیع کینوس اور آفاقی تصور مرتب کر رہے ہیں۔ حسین سحر کی شاعری کا یہ وسیع کینوس جدید اسلوب میں پر شکوہ' بلند' وقیع اور صالح روایات و آثار کا متحمل ہے۔ اسی کے ساتھ زندگی کے بہت سارے مسائل درد' اعتبار' محبت' وفا' خلوص' حکمت' شجاعت اور جہد ان کی شاعری کے سفر میں پیش پیش ہیں۔ وہ پر شکوہ لہجہ کے شاعر ہیں جو زندگی کی آفاقی قدروں کی ہم نوائی بھی کرتے ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعہ اس کے تہذیبی عمل میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ حسین سحر کے یہاں ان کا پُرشکوہ آفاقی اسلوب جگہ جگہ نمایاں ہے ۔

تمام عمر تخاطب مرا مجھی سے رہا
سوال میں نے کئے ہیں جواب میرے ہیں

☆

جدھر سے گزریں جہاں جائیں سب نگران کے
مسافر اپنی کوئی سرزمیں نہیں رکھتے

☆

میں لہلہاتی شاخ کو سمجھا تھا زندگی
پتا گرا تو درسِ فنا دے گیا مجھے
چاروں طرف سلگتے بگولے ہیں رقص میں
محسوس ہو رہا ہے کہ صحرا سفر میں ہے

☆

وحشتِ خلا کی وسعتِ بے پایاں کیا کروں
مجھ کو تو اپنی ذات کی پہنائی چاہئے

حسین سحر شعریاتِ عصر کی تعمیر اور تسلسل میں اپنے مخصوص پر شکوہ لہجہ اور آفاقی حیثیت کی

وجہ سے غیر معمولی تجربے سے گزر رہے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ زندگی کی ترتیب وتزئین اور اس کے تمثیلی افکارات میں برابر کے شریک ہیں۔ شاعری کو آفاقی حیثیت سے جوڑنا اور زمین یا خاکی تحدیدات کے ساتھ توافق پیدا کرنا حسین سحر کا کام ہے۔ ان کی نظر وقت کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ حسین سحر کے شعری اظہارات میں صرف شاعری برائے شاعری کا عمل نہیں ملتا بلکہ اسی کے ساتھ تعمیر حیات اور شاعری برائے زندگی کی تمثیل ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں کوئی حکمت کوئی نکتہ کوئی شکوہ بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ قاری صرف اشعار کی صوتی اور معنوی تزئین ہی سے لطف اندوز نہیں ہوتا بلکہ وہ اشعار کی صوتیات اور معانی سے گزرتا ہوا بصیرت تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جائے گا کہ حسین سحر کی شاعری ہمیں صوتیات اور معانی کی مسرت سے گزارتی ہوئی بصیرت تک پہنچاتی ہے۔ مسرت سے بصیرت کا سفر ہی شاعری کے کینوس کو پھیلاتا ہوا اسے آفاقی سرحدوں تک پہنچاتا ہے۔ مسرت اور بصیرت کے اندر ہی جذبات واحساسات کے وہ تمام مضمرات شامل ہیں جن پر شعریات کے مباحث قائم ہوتے ہیں۔ حسین سحر نے نہ صرف یہ کہ اس سفر کو طے کیا ہے بلکہ اس راہ میں انہوں نے دوسروں کے لئے اپنے نشانات قدم بھی چھوڑے ہیں۔

یہاں تو اپنی ہی خوبی ہے ذات کی دشمن
سلگ رہے ہیں کئی پیڑ اپنی چھاؤں میں

جن خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں
دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں ایسے خواب

☆

ہے میرے چاروں طرف اک ہجوم چہروں کا
حصار ذات میں اس طرح کھو گیا ہوں میں

☆

وصال و ہجر کی ہر کیفیت محبت ہے
کوئی بھی وقت ہو اس دائرے میں آئے گا

☆

میں نے تو کاغذ پہ اس کا نام لکھا تھا سحر
حرف سارے اوڑھ کر خوشبو کہاں سے آ گئے

حسین سحر کی شاعری میں عصری آگہی اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی جمالیات بھی ملتی ہے۔ بیسویں صدی میں صنعتی ترقیات کے ذیل میں ‘محنت’ کام اور معاشرہ کی جو جمالیات بدلی ہے اور زندگی’ مشینی زندگی سے جس قدر مغلوب ہوتی گئی ہے۔ اس کا وسیع تر احساس ان کے یہاں ملتا ہے۔ جدید احساسات سے بھرے ہوئے ان کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو ہمارے اجتماعی لاشعور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں حسین سحر کا یہ شعر۔

دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں یہ کہتی ہیں
حیات روز سلگتی ہے کارخانوں میں

اس ’’حیات روز سلگتی ہے‘‘ کا جواب نہیں۔ اس ایک شعر میں پورے عہد کو بند کر دیا گیا ہے۔ مشینی زندگی اور محنت کی جمالیات پر یہ شعر ایک ایسا وجدانی کلیہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح مشینی زندگی اور اس کے اعمال میں توافق کے سبب انسانی زندگی کس حد تک اپنا غیر مرئی’ پیرہن بدلتی ہے اور کس طرح اندرون میں تاریکیوں کا انعکاس نمایاں ہوتا ہے۔ حسین سحر اس احساس کو خبر کے ساتھ نظر کی وسعتوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے خود بخود ان کے یہاں ایک جمالیاتی فعالیت پیدا ہو گئی ہے وہ کہتے ہیں۔

ذہن جب تاریک ہو جائیں مشینوں کے طفیل
جذب دل کی روشنی کو عام کرنا چاہئے

☆

اس قدر راتوں کی تاریکی کے ہم عادی ہوئے
صبح کی پہلی کرن چمکی تو ڈر کر رہ گئے

اسی ذیل میں درج ذیل شعر کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

جس کی بنیاد پہ نفرت کا نہ سایہ جائے
ایسا اک شہر محبت کا بسایا جائے

اپنی شعری تمثیلات میں حسین سحر اکثر حال' جذبہ اور عمل کے توافق سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے اشعار میں دعاوی اور دلائل ایک ہی جگہ بہ آسانی جمع ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دعاوی خود دلائل پیدا کر دیتے ہیں۔ لہٰذا شعر بغیر کسی قشری قوت کے اپنے آپ میں مکمل معنوی اکائی بن جاتا ہے۔ یہ دلائل کو اپنے آپ سے اس قدر قریب کر لیتا ہے کہ شعر سے ہماری نظری نہیں ہٹتی ہے۔ شعری عمل کی تہذیب کا یہ انوکھا طریقہ ہے۔

میں ہوں گرداب کے حلقے میں مگر چاہتا ہوں
دور تک یونہی مرے ساتھ کنارہ جائے

اب آپ دیکھیں کہ دوسرے مصرعہ میں جو معنی کی تخریج ہے وہ پہلے ہی مصرعہ کے عمل میں موجود ہے یا اس سے لحاتی طور پر اتفاق قائم کر رہی ہے۔ عام طور پر تخلیقی عمل ایسے موقعوں پر ان استشاروں اور تلازموں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے جو اجتماعی عادات اور اعمال سے افتراق کے بغیر پیدا ہوں' مگر فوری طور پر شعر کی خوبی ہمیں ایسے افتراق سے بے گانہ کر دیتی ہے اور ہماری شعری سوچ کو غیر متوقع معنوی اعماق کی طرف لے چلتی ہے۔ یہ ذائقہ شاعری کے بعید از قیاس اور بے مثل مقامات کی سرحدوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ایسے میں تفہیمات کا دائرہ بھی اپنے حدود کو وسیع کرتا ہوا اپنے مخازن کی طرف پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس ذیل میں یہ دو اشعار دیکھیں۔

روح کے زخموں کی شادابی کہاں ہے مستقل
ایک دن یہ لہلہاتی فصل بھی کٹ جائے گی

☆

میرے لئے تو سانس بھی لینا محال ہے
یہ کون زندگی کی دعا دے گیا مجھے

حسین سحر اردو شاعری میں 60ء کے بعد تیار ہونے والی جدید نسل سے تعلق رکھتے ہیں

جن میں احمد فراز' ندا فاضلی' مظفر حنفی' ظفر اقبال' عرفان صدیقی' عنوان چشتی' مخمور سعیدی' امجد اسلام امجد' شہزاد احمد' علیم اللہ حالی' لطیف الرحمٰن' مظہر امام' علیم صبا نویدی' اقبال ارشد' ناصر زیدی' انور شعور' پروین شاکر' ساجدہ زیدی' ثروت عثمانی' توصیف تبسم' ظفر گورکھپوری' فرحت قادری' صدیق مجیبی' رفعت سروش' شہریار' بشیر بدر اور احمد عقیل وغیرہ کا نام آتا ہے۔ انہوں نے جدید اردو شاعری کی ہیئتی اور معنوی تشکیل و ترتیب میں اپنے فکری اور تخلیقی امتیازات کے ذریعہ آفاقیت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ قابل قبول حد تک جدیدیت کے استشاروں کو قبول کرتے ہوئے اپنے رنگ کو نمایاں کرتے ہیں۔ شعری تہذیب کے عمل میں وہ اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی شناخت خود ان کا اپنا حوالہ ہے۔ وہ اسلوب ہیئت اور ادائیگی میں تو جدید تر لہجہ میں بولتے ہیں مگر فکر اور تجربے میں آفاقیت اور شکوہ کو فروغ دیتے ہیں۔

اوپر عرض کیا گیا تھا کہ علامہ اقبال نے ہماری آرکی ٹائپیا اجتماعی لاشعور پر جو اثر ڈالا ہے اس سے جدید سے جدید لہجہ اور ہیئت بھی متاثر ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں ادب و فن کی ہر تخلیقی جہت بالواسطہ یا بلاواسطہ' منفی یا مثبت' شعوری یا لاشعوری طور پر اس اثر میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے خود فنی تعمیر کا عمل ہی اپنے اظہار میں اس نفسیات کا شاہد ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اس اظہار میں وہ سارے مکالمے اور تحدیدات شامل ہو جائیں جو ادب و زندگی کو امتیاز عطا کرتی ہیں۔ اور اسے ہمہ جہتی حوالوں میں پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ اسی کے ساتھ یہ سفارشات بھی قابل عمل بن جاتی ہیں کہ شعری تخلیقات میں اجتماعی لاشعوریت کو شاعر اپنی ذاتی تحدیدات میں پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ حسین سحر کی شعری اور تخلیقی تحدیدات خود ہی ایسے حوالوں کو پیش کرتی ہیں جو انہیں ایک جانب تو جدید عملیات کا نشان عطا کرتی ہیں دوسری جانب ہر قدم پر انہیں اس پر شکوہ آہنگ اور آفاقی تصور کے ساتھ قائم رکھنا چاہتی ہے۔ جدید مزاج اور عملیات کا یہ نشان ان کے پرشکوہ اور بلند لہجہ کو آفاقی توسیع کی طرف لے چلتا ہے۔

حسین سحر کی شاعری کا یہ امتیاز ہمیں زندگی کی جستجو میں کسی قشری قوت پر غیر محسوس طریقے سے اعتماد اور انحصار بھی سکھاتا ہے اور زندگی کی انفعالیت سے آزاد بھی کرتا ہے۔ حسین سحر کی شاعری میں ہمیں ان تمام توقعات سے گزرنا پڑتا ہے جو کسی شاعر کے شعری مزاج اور آہنگ میں مخصوص زاویہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔ حسین سحر کی شاعری کی اجمالی تعریف قائم کرنے میں ان کا

اسلوب معاون ہے۔حسین سحر ایک ایسے Calibre کے شاعر ہیں۔ جو اپنے شعری اظہارات کو مطلوب معیار اورحسیت سے آشنا کرانے کے لئے اسے پے در پے تجربوں سے گزارتے ہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایسے اسالیب استعمال کرتے ہیں جو بہت بلند وبالا ہوں اور اپنے بلند آہنگ کے ذریعہ تخلیق کے عمل کو بارعب اور قابل قدر بناتے ہیں۔ حسین سحر کے یہاں زندگی دراصل تمناؤں جذبوں اور محسوسات کی تحدید ہے۔ کبھی کبھی زیب داستان کے لئے وہ ان حدود سے باہر بھی نکل آتے ہیں مگر جلد اپنی جگہ لوٹ آتے ہیں۔ شعوری عمل اور تخلیقی احساسات کے لئے جس قدر آزاد اور پروقار ہوکر جینا پڑتا ہے، حسین سحر اس سے زیادہ آزاد اور پروقار ہیں۔ وہ زندگی اور شاعری کو بہ یک وقت ایک ہی خانے میں رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس لئے شعری محاظرات بھی انہیں رویوں کو اختیار کرتے ہیں جو زندگی اور فن کے درمیان روابط پیدا کرسکیں۔ حسین سحر اس عمل میں بہت کامیاب ہیں۔ وہ شاعری میں ایسے تلازموں سے بھی کام لیتے ہیں جو تخلیق کی کسی جہت سے خود بخود نمودار ہوتے ہیں۔ لہٰذا واقعاتی سطح پر تو یہ کوئی نئی بنیاد نہیں ہے مگر شعری استعاراتی اسالیب ایسے بیان کو بہت زیب دیتے ہیں۔ مثلاً حسین سحر کا ایک شعر دیکھئے۔

میں تو گرداب بلا میں ڈوب ہی جاتا مگر
اس قدر دریا میں یہ بازو کہاں سے آ گئے

گرداب بلا کے اندر ڈوبتے ہوئے شخص کو عموماً کسی خارجی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے، مگر یہاں سہاروں کا محل خود ڈوبتے ہوئے شخص کی ذات ہے۔ لہٰذا یہ شعر خود اعتمادی کو مہمیز لگاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حسین سحر ہمارے دور کے ان بڑے شاعروں میں سے ہیں جو شعری ترغیبات اور تمثیل کو اردو میں بڑے کینوس پر پیش کررہے ہیں۔ جدید اسلوب انسانیت اور اخلاق اپنے مختلف تیور اور تہہ داریت کے ساتھ ان کے یہاں جمع ہیں۔ وہ پرشکوہ لہجہ اور پروقار آہنگ کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری آفاقی تصور کو پیش کرتی ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنے معاصر شعری ادب میں ممتاز ہیں۔

ڈاکٹر سید اقبال احمد واجد
(الجبیل سعودی عرب)



لفظوں میں خموشی کو بدلنے نہیں دیتے
اس برف کو کچھ لوگ پگھلنے نہیں دیتے

اس درجہ ہوئے ضبطِ غمِ عشق کے عادی
آنسو بھی ہم آنکھوں سے نکلنے نہیں دیتے

محروم رکھا دل کو تمنا کے لہو سے
اس نخل کو ہم پھولنے پھلنے نہیں دیتے

کس درجہ ستم گار ہیں رہبر یہ ہمارے
دو گام بھی جو قافلہ چلنے نہیں دیتے

یہ کیسے سہارے ہیں سحر ہم کو میسر
گرتے ہیں اگر ہم تو سنبھلنے نہیں دیتے



یادوں میں کئی درد کے پہلو نکل آئے
آیا جو ترا نام تو آنسو نکل آئے

ہم شہر سے نکلے ہیں کچھ اس طرح کہ جیسے
سورج سے کرن پھول سے خوشبو نکل آئے

یوں دشت میں ہر سائے کو میں دیکھ رہا ہوں
شاید کسی جانب کوئی آہو نکل آئے

رستے میں تو تنہا تھا میں لیکن سرِ منزل
دیکھا تو مسافر کئی ہر سو نکل آئے

اس درجہ چراغاں کا سحر شوق تھا مجھ کو
پلکوں پہ سرِ شام ہی جگنو نکل آئے



ملنا چاہے تو کسی طور بھی مجبور نہیں
وہ اسی شہر میں رہتا ہے کہیں دور نہیں

تو نہ ہو گا تری یادوں سے بہل جائے گا
اسقدر بھی تو فسردہ دل رنجور نہیں

وہ تو اپنوں سے بھی بیگانہ صفت ملتا ہے
اس کی عادت ہی کچھ ایسی ہے وہ مغرور نہیں

جس کو دیکھو وہی پژمردہ نظر آتا ہے
کوئی بھی شخص ترے شہر میں مسرور نہیں

کیسے گزریں گے بھلا شام و سحر فرقت کے
زلف شبرنگ نہیں چہرہ پر نور نہیں



منزل ہے کوئی اور ہی رستا ہے کوئی اور
ہم جس کے مسافر ہیں وہ دنیا ہے کوئی اور

دن رات ہے بس آہوئے معنی کا تجسس
ہم جس میں بھٹکتے ہیں وہ صحرا ہے کوئی اور

میں اپنے خد وخال سے خود بھی نہیں واقف
آئینے میں دیکھا ہے جو چہرہ ہے کوئی اور

یہ خون نہیں ہے کہ جو رگ رگ میں رواں ہے
بہتا ہے جو یوں مجھ میں وہ دریا ہے کوئی اور

دیکھا ہے بڑے غور سے افلاک کا دامن
قسمت کا سحر اپنی ستارا ہے کوئی اور



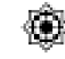
کوئی حسرت کوئی بھی ارماں نہیں
کون کہتا ہے یہ دل ویراں نہیں؟

میری قسمت میں نہیں عکسِ جمال
آئنہ تو ہوں مگر حیراں نہیں

احتیاطِ غم اسی کا نام ہے
دل ہے گریاں اور لب گریاں نہیں

یاد کرنا بھی تجھے مشکل ہوا
بھول جانا بھی تجھے آساں نہیں

اس خرابے میں جہاں دیکھا سحرؔ
آدمی تو ہیں مگر انساں نہیں



ضبطِ غم میں جو جھلکتے تھے مری آنکھوں سے
آج آنسو وہی بہتے ہیں تری آنکھوں سے

میرے ہی دل پہ برستے ہیں وہ قطرہ قطرہ
اشکِ غم روز جو بہتے ہیں کئی آنکھوں سے

میرا بس ہو تو کسی کو بھی نہ روتا دیکھوں
پی ہی جاؤں میں دکھوں کی یہ نمی آنکھوں سے

سانس جاتی ہوئی لوٹ آئی شکستہ جاں کی
ہم نے دیکھی ہے عجب چارہ گری آنکھوں سے

ہم نے اسطرح دیا اپنی محبت کو خراج
چوم لی درد کے نیزے کی انی آنکھوں سے

دل کی بینائی بھی اک نور ہوا کرتی ہے
صرف مخصوص نہیں دیدہ وری آنکھوں سے

جن کی قسمت میں نہیں جلوۂ تعبیرِ سحر
خواب ہم دیکھ رہے ہیں وہ کھلی آنکھوں سے



جب تری یاد چمک اُٹھتی ہے آنسو آنسو
شب کے جنگل میں بکھر جاتے ہیں جگنو جگنو

اسقدر پھیلا ہوا دھوپ کا سناٹا ہے
دل پکار اٹھا ہے بے ساختہ گیسو گیسو

تو کہاں دُور سرابوں میں چھپا بیٹھا ہے
میں نے ڈھونڈا ہے تجھے دشت میں آہو آہو

جب مری کشتیٔ جاں گھرتی ہے گردابوں میں
چار اطراف ابھر آتے ہیں بازو بازو

تجھ کو چھونا تو کُجا دیکھنا ہی کافی ہے
میرے انفاس میں بھر جاتی ہے خوشبو خوشبو

نفرتِ شہر کا جب میں نے مداوا چاہا
میرے اندر سے صدا اُٹھی ہے باہو باہو

رنگ بکھرے تو سحر سارا فسوں ٹوٹ گیا
ورنہ وہ شخص نظر آتا تھا جادو جادو



دل اسیرِ گردشِ افلاک کیسے ہو گیا؟
سوچتا ہوں یہ گہر تھا خاک کیسے ہو گیا؟

ہم تو سمجھے تھے کہ مٹ سکتا نہیں داغِ فراق
اسقدر جلدی رفو یہ چاک کیسے ہو گیا؟

ایک اک کر کے گرے شاخ و گل و برگ و ثمر
رفتہ رفتہ سب چمن خاشاک کیسے ہو گیا؟

کل تلک جس کے لبوں پر مصلحت کی مہر تھی
آج حیراں ہوں کہ وہ بیباک کیسے ہو گیا؟

دل سے اک اک کر کے ساری خواہشیں رخصت ہوئیں
یہ صنم خانہ بتوں سے پاک کیسے ہو گیا؟

اس کی آنکھوں سے چھلک اٹھے ہیں آنسو کرب کے
اس کو میرے درد کا ادراک کیسے ہو گیا؟

دل دکھاتا ہے پسِ چہرہ بھی کتنے نقش آج
آئنہ یہ اسقدر سفاک کیسے ہو گیا؟

تُو تو خوشیوں کے لباسِ نو میں رہتا تھا سحر
پیرہن غم کا تری پوشاک کیسے ہو گیا؟



خبر نہ تھی سفر اس مرحلے میں آئے گا
کہ اس کا گھر بھی مرے راستے میں آئے گا

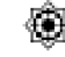
رہے گا حُسن کہاں تک گریز پا مجھ سے
وہ عکس ہے تو مرے آئنے میں آئے گا

وصال و ہجر کی ہر کیفیت محبت ہے
کوئی بھی وقت ہو اس دائرے میں آئے گا

جو دن کے جاگتے خوابوں میں مل نہیں سکتا
اک ایسا کیف مجھے رت جگے میں آئے گا

بھڑک رہی ہے جو رہ رہ کے روشنی کی لَو
ہوا کا زور تو جلتے دیئے میں آئے گا

چھپائے چھپتی ہے کب تک دلوں کی کیفیت
سحرؔ یہ کرب تو ہر قہقہے میں آئے گا



حرف جونہی زبان سے نکلا
تیر گویا کمان سے نکلا

کھینچ لائی اسے کشش اسکی
جو بھی اس خاکدان سے نکلا

چھا گئی چار سمت ویرانی
جونہی گاہک دکان سے نکلا

ایسے نکلا ہے آنکھ سے آنسو
جیسے مالک مکان سے نکلا

وہ ستارہ نہ لوٹ کر آیا
جو حدِ آسمان سے نکلا

بت گروں نے بہایا خونِ جگر
تب کہیں بت چٹان سے نکلا

گھر گیا پھر سے مشکلوں میں سحرؔ
میں جو غم کی امان سے نکلا

حوصلہ خود میں سمندر سے سوا رکھنا تھا
اس سے ملنے کے لئے دل بھی بڑا رکھنا تھا

اب پشیماں ہو بہت ترکِ تعلق کر کے
واپسی کا کوئی رستہ تو کھلا رکھنا تھا

ہم نہ کہتے تھے کہ سب برف پگھل جائے گی
دل کو احساس کی گرمی سے جدا رکھنا تھا

جھلملاتا ہے جو اک اشکِ وفا پلکوں پر
یہ گہر سیپ کے دامن میں چھپا رکھنا تھا

عمر کے طاق سے اٹھتا ہے دھواں رہ رہ کر
ایک ننھا سا دیا اس میں جلا رکھنا تھا

شاید آ جاتا کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
موسمِ حبس میں دروازہ کھلا رکھنا تھا

دشتِ تنہائی کی حدت میں سحر جلتے ہو
دل میں یادوں کا اک شہر بسا رکھنا تھا



اب ہم اسیرِ گردشِ دنیا نہیں رہے
طغیانیوں کے شور میں دریا نہیں رہے

پامال کر رہی ہے ہمیں کیوں ہوائے دہر؟
ہم تو کسی کا نقشِ کفِ پا نہیں رہے

ہردم ہے اپنے ساتھ خیالوں کا اک ہجوم
تنہا بھی رہ کے ہم کبھی تنہا نہیں رہے

اپنی صدائیں گنبدِ ماضی میں رہ گئیں
ہم اپنے دور میں کبھی زندہ نہیں رہے

ہم نے طلب کیا ہے فقط اپنا حقِ سحر
دامن کسی کے سامنے پھیلا نہیں رہے

عمر کا ہر لمحہ اک میزان ہونا چاہیے
سامنے اک حشر کا میدان ہونا چاہیے

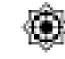
آنکھ جو کچھ بھی کہے سنتے ہی دل میں جذب ہو
پیار کا لہجہ بہت آسان ہونا چاہیے

مشکلیں ساری سروسامان کے ہونے میں ہیں
زندگی کو بے سرو سامان ہونا چاہیے

مل ہی جائے گا خدا کی ذات کا عرفان بھی
پہلے اپنی ذات کا عرفان ہونا چاہیے

زندگی کا ایک پل بھی مجھ سے چھن سکتا نہیں
اسقدر کامل مرا ایمان ہونا چاہیے

چاہتیں یونہی نہیں رہتیں سدا محکم سحر
ترکِ الفت کا بھی کچھ امکان ہونا چاہیے



یہ کس نے کہہ دیا مجھے تنہائی چاہیے؟
یادوں کی دل میں انجمن آرائی چاہیے

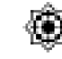
دشتِ خلا کی وسعت بے پایاں کیا کروں؟
مجھ کو تو اپنی ذات کی پہنائی چاہیے

آنکھوں سے تو دکھائی مجھے دے رہا ہے سب
لیکن مجھے شعور کی بینائی چاہیے

پلکوں پہ کب سے تیر رہا ہے اک اشکِ غم
ایسے گہر کو سیپ کی گہرائی چاہیے

شعر و سخن کی دائمی تاثیر کے لئے
جذبوں کا حسن فکر کی رعنائی چاہیے

اسکے سوا میں کچھ بھی نہیں چاہتا سحرؔ
اس در پہ اپنی آہ کی شنوائی چاہیے



جب سے آنکھوں میں ہے بسا صحرا
ہر گلستاں ہمیں لگا صحرا

بے نشاں، چپ، اجاڑ، بے سایہ
زندگی ہے کہ دھوپ کا صحرا

دل کہ اک گلشنِ تمنا تھا
دیکھتے دیکھتے ہُوا صحرا

کتنا بے حد و بے کنار ہے یہ
میرے غم کا ہے آئنہ صحرا

میں مسافر ہوں شہرِ امکاں کا
ہے مرا ایک نقشِ پا صحرا

دل کے چاروں طرف ہیں آئینے
کن سرابوں میں کھو گیا صحرا

میری ویرانیوں کے ساتھ سحر
دو قدم بھی نہ چل سکا صحرا



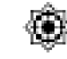
حیرت ہے وہ شخص بھی کتنا پیاسا تھا
جس کے دروازے پر دریا بہتا تھا

رنگ برنگے چہروں میں مَیں رہتا تھا
بھرے جہاں میں میں بھی کتنا تنہا تھا

میری آنکھ نے تیرا آنسو جذب کیا
میرا آنسو تیری آنکھ سے ٹپکا تھا

شہر کی رونق میں جی میرا کیا لگتا؟
میرے دل کے اندر تو اک صحرا تھا

اب وہ شجر کی صورت ہے چھتنار سحر
دل میں درد کا ننھا بیج جو بویا تھا



کوئی خواب تمنا بھی نہیں ہے
یہ دل اتنا اکیلا بھی نہیں ہے

اسے کیسے بتاتے حال اپنا؟
کہ اس نے ہم سے پوچھا بھی نہیں ہے

تجھے اے بے وفا ہم بھول جائیں
کبھی ہم نے یہ سوچا بھی نہیں ہے

سمجھ بیٹھے جو پانی ریت کو بھی
مسافر اتنا پیاسا بھی نہیں ہے

نہیں ہے آئنے میں عکس میرا
مگر یہ اس کا چہرہ بھی نہیں ہے

عجب انداز سے نکلا ہے سورج
اجالا کیا اندھیرا بھی نہیں ہے

سحر اس کا تصور کیا کروں میں؟
جو جلوہ میں نے دیکھا بھی نہیں ہے

❁

بند کانوں کو رکھا ہونٹوں پہ تالے رکھے
ہم نے جینے کے سبھی ڈھنگ نرالے رکھے

عمر بھر ہم نے زمانے سے الگ سوچا ہے
عمر بھر ہم نے اصول اپنے نرالے رکھے

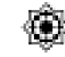
آنکھ کو چاہیے سیپی میں رکھے اپنے گہر
آنسوؤں کو نہ ہر اک وقت اچھالے رکھے

کوہ پیمائی کے آداب بھی کچھ ہوتے ہیں
آدمی چلتے ہوئے خود کو سنبھالے رکھے

ظلمتوں میں بھی ہمیں جینے کی کچھ آس رہے
یوں الگ باندھ کے اک سمت اجالے رکھے

زندہ رہنے کا یہی سب سے ہے آساں رستہ
آدمی خود کو مقدر کے حوالے رکھے

دشتِ غم کے ہے مسافر کی یہی شانِ سحر
سر پہ ہو خاکِ سفر پاؤں میں چھالے رکھے



اب نہ کسی دستک پر در کی کھاؤں گا میں دھوکے
ابھی ابھی سوکھی ہیں میری جاگتی آنکھیں روکے

باہر تو ہے گھپ اندھیارا چاند کہاں نکلا ہے؟
کھلے ہوئے ہیں کس کی آس میں اپنے نین جھروکے

ہجر کی اک اک ٹیس کا یارو اپنا ایک مزا ہے
دیکھو اپنے دل میں اس خنجر کی نوک چبھو کے

دل میں نفرت کی تلخی ہے ہونٹوں پر شیرینی
کیسے پھول اگاؤ گے تم باغ میں کانٹے بو کے

لہو کی خوشبو تو خوشبو ہے دامن سے آئے گی
قاتل چاہے کتنا صاف کرے ہر دھبہ دھو کے

تا کہ قائم بھرم رہے غیروں کی بھی چاہت کا
سوچ سمجھ کر کچھ اپنوں سے کھاتا ہوں میں دھوکے

ہر سننے والے کے دل پر اثر کرے گی دُونا
بات کرو گر لہجے میں تو اپنے درد سمو کے

نہیں سکون وہاں بھی حاصل اپنے شہر سے بڑھ کر
سحر ابھی تو صحراؤں سے آیا ہوں میں ہو کے



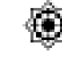
جس کی بنیاد پہ نفرت کا نہ سایا جائے
شہر اک ایسا محبت کا بسایا جائے

جن سے خدشہ ہو کہ کچھ اور بڑھے گی ظلمت
ان چراغوں کو نہ محفل میں جلایا جائے

دل میں یادوں کا بسیرا ہی رہے اچھا ہے
یوں پرندوں کو نہ شاخوں سے اڑایا جائے

دیکھتے دیکھتے اب تھک سی گئی ہیں آنکھیں
ایک ہی خواب نہ ہر روز دکھایا جائے

سالہا سال عبادت سے سحر بہتر ہے
چند روٹھے ہوئے لوگوں کو منایا جائے



دل میں یاد آئی تو جادو کی طرح پھیلے گی
اس اندھیرے میں یہ جگنو کی طرح پھیلے گی

صبح ابھرے گی ترے چہرۂ سیمیں کی طرح
شب ترے ریشمی گیسو کی طرح پھیلے گی

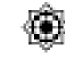
دل کی جو بات ہے وہ دل میں چھپی رہنے دو
لب پہ آئے گی تو خوشبو کی طرح پھیلے گی

کہیں ٹھہرے گی نہ اک بوند لہو کی دل میں
نوک مژگاں پہ یہ آنسو کی طرح پھیلے گی

ہم گھریں گے جو بھنور میں تو ہماری خاطر
موجِ طوفاں کسی بازو کی طرح پھیلے گی

یہ تمنا کی صدا ہے نہ دباؤ اسکو
اسکی جھنکار تو گھنگھرو کی طرح پھیلے گی

مرا پیغام محبت کا ہے پیغام سحر
یہ صدا وارث و باہو کی طرح پھیلے گی



آ گئے دل میں غم و رنج کے سائے کیسے؟
گھر یہ اپنا ہے تو پھر لوگ پرائے کیسے؟

میری آنکھوں سے ترا درد چھلک اٹھتا ہے
ایک کوزے میں سمندر یہ سمائے کیسے؟

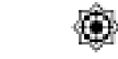
فکر و فن میرا ترے حسن کا آئینہ ہے
میرے شعروں میں ترا عکس نہ آئے کیسے ؟

پرسکوں جتنا بھی چاہے ہو مزاجِ دریا
کوئی ٹوٹی ہوئی کشتی کو بہائے کیسے ؟

دیکھنا ہو تو کبھی شام کا منظر دیکھو
چڑھتے سورج سے کوئی آنکھ ملائے کیسے؟

آ گئے اشک جو آنکھوں میں تو بہنے دیجے
سیپ نکلے ہوئے موتی کو چھپائے کیسے؟

اصل قوّت تو سحر جذبۂ پرواز میں ہے
صرف اک پر ہی پرندے کو اڑائے کیسے؟



دل میں حسرت دبی رہ گئی
بات پھر ان کہی رہ گئی

سوچتا ہوں کہ تیرے بغیر
زندگی میں کمی رہ گئی

میں تو چپ ہوں مگر آنکھ میں
آنسوؤں کی نمی رہ گئی

گرچہ ہر سو تھا دریا رواں
پھر بھی اک تشنگی رہ گئی

باغ تو سب کا سب جل گیا
ایک ٹہنی ہری رہ گئی

کتنے آگے نکل آئے ہم
ہم سے پیچھے صدی رہ گئی

دل کے دروازے سب بند تھے
ایک کھڑکی کھلی رہ گئی

کورا کاغذ انہیں جا ملا
اور چٹھی لکھی رہ گئی

خواب تو خواب تھا کٹ گیا
خواب کی روشنی رہ گئی

میرے حصے کی جو تھی سحر
کس طرف وہ خوشی رہ گئی؟

شام تنہائی کو اس طرح گزارا جائے
دل کے آنگن میں کوئی چاند اتارا جائے

زندگی زہر بھرا نقش نظر آتی ہے
کوئی تو رنگ محبت کا ابھارا جائے

تری تصویر کو دیکھیں تری خوشبو ڈھونڈیں
شب فرقت کو اسی طور گزارا جائے

میں ہوں گرداب کے حلقے میں مگر چاہتا ہوں
دور تک یونہی مرے ساتھ کنارا جائے

پھیل ہی جائے گا سورج کا اجالا ہر سو
پہلے آفاق سے یہ صبح کا تارا جائے

خودبخود ٹوٹ گرے پاؤں کی زنجیر سحر
مجھ کو کرتا ہوا موسم وہ اشارا جائے



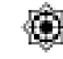
کسی دن ایسے بھی میں اس سے عرضِ حال کروں
جواب جس کا نہ ہو اس سے وہ سوال کروں

میں آگے بڑھ کے ملوں کیوں نہ اپنے دشمن سے
تعلقات کی دنیا میں یہ کمال کروں

میں اشک بن کے تری آنکھ سے ٹپک جاؤں
یوں اپنے زخمِ محبت کا اندمال کروں

سمندروں کو کھنگالوں میں اپنی نظروں سے
ہوا کے نقشِ کفِ پا کو پائمال کروں

تصورات میں اسکی شبیہہ لا کے سحر
فراق میں بھی بسر لمحۂ وصال کروں



موجزن ان آنکھوں میں غم کا یوں سمندر ہے
جیسے دور تک پھیلا نیلگوں سمندر ہے

میرے جسم و جاں میں بھی ہے عجیب سا رشتہ
باہر ایک صحرا ہے اندروں سمندر ہے

ایک ایک قطرے میں شور ہے تلاطم کا
جو رگوں میں بہتی ہے جوئے خوں سمندر ہے

شاید اس نے دیکھا ہے میرے دل کا آئینہ
ورنہ اتنی حیرت میں گم یہ کیوں سمندر ہے؟

کس کی پیاس کے آگے آب آب ہے دریا
ظرف دیکھ کر کس کا سرنگوں سمندر ہے؟

عقل اور جنوں میں ہے فرق اس قدر یارو!
عقل ایک دریا ہے اور جنوں سمندر ہے

جانے کس قدر طوفاں ہیں سحر نہاں دل میں
دیکھئے تو ظاہر میں پُر سکوں سمندر ہے



دل میں اُس کی یاد کے جگنو کہاں سے آ گئے؟
شہر میں یہ دشت کے آہو کہاں سے آ گئے؟

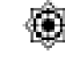
اُس کی باتوں میں چھنکتی پائلوں کے گیت ہیں
تیغ سے لہجے میں یہ گھنگرو کہاں سے آ گئے؟

دل کا ریگستان تو اک عمر سے بے آب تھا
آنکھ میں بے اختیار آنسو کہاں سے آ گئے؟

میں تو گردابِ بلا میں ڈوب ہی جاتا مگر
اس قدر دریا میں یہ بازو کہاں سے آ گئے؟

روح کے صحرا میں لہرائے ہیں ابرِ نو بہار
دھوپ کے عالم میں یہ گیسو کہاں سے آ گئے؟

میں نے تو کاغذ پہ اس کا نام لکھا تھا سحرؔ
حرف سارے اوڑھ کر خوشبو کہاں سے آ گئے؟



خیال اس کا دل میں آ کے رہ گیا
دیا سا ایک جھلملا کے رہ گیا

جو اس کا چہرہ آیا میرے دھیان میں
نظر میں چاند جگمگا کے رہ گیا

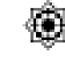
میں چل سکا نہ خارزارِ عشق میں
بس ایک دو قدم بڑھا کے رہ گیا

چھپا ہوا ہے دھڑکنوں کے شور میں
وہ دل میں اسطرح سما کے رہ گیا

رہی نہ تابِ دید جلوہ گاہ کی
میں آستاں پہ سر جھکا کے رہ گیا

جو دوستوں نے دعویٰ وفا کیا
جواب میں میں مسکرا کے رہ گیا

زباں سے کہہ سکا نہ حالِ دل سحرؔ
بس اشک آنکھ سے بہا کے رہ گیا



عشق میں خود کو اس طرح گرد و غبار کر دیا
جاں تھی سو اس پہ واردی دل تھا نثار کردیا

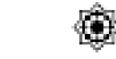
دیکھا جو تیز رو بہت شوق کا اپنے قافلہ
ہم نے بھی اپنے آپ کو نذرِ غبار کر دیا

میں تھا الگ قطار سے اسکی نگاہ جو پڑی
چاہنے والوں میں مرا اس نے شمار کر دیا

غم کو تھی چاہئے ذرا اشکِ رواں کی روشنی
دل سے مژہ کے طاق پر رکھا اتار کر دیا

میں وہ چراغ تھا جسے جلنا تھا دستِ خاک پر
اس نے ہوا کے دوش پر مجھ کر سوار کر دیا

دل تھا وہ زرد رو شجر جو تھا خزاؤں کا ہدف
اسکی سحر نگاہ نے رشکِ بہار کر دیا



محبت ایک دن تخلیق یہ شہکار کر دے گی
کہ ساری دھوپ زیرِ سایۂ دیوار کر دے گی

وفا کے بے پنہ جذبے میں وہ ان دیکھی طاقت ہے
کہ یہ کچے گھڑے کو بھی بھنور سے پار کردے گی

ہمارے دل کے چاروں سمت غم کی یورشِ پیہم
بالآخر یہ عمارت ایک دن مسمار کردے گی

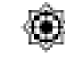
کہو کچھ تو کہو، بولو زباں سے کچھ نہ کچھ بولو
یہ چپ رہنے کی عادت ایک دن بیمار کردے گی

حیات و موت کا جو فاصلہ چشمِ خرد میں ہے
جنوں کی ایک جستِ بے خطر ہموار کردے گی

پہنچنے دے گی منزل تک نہ یہ دنیا کبھی ہم کو
کھڑی ہر ہر قدم پر اک نئی دیوار کر دے گی

حقیقت فاش کر دے گی ہماری زندگی ہم پر
اگر یہ خواب ہے تو خواب سے بیدار کردے گی

سحرؔ صحرائے الفت میں یہ تنہائی سی تنہائی
سرابوں کے سفر کو اور پر اسرار کر دے گی



مہر ومہ سے بھی کہیں بڑھ کے منور نکلا
وہ ستارہ جو مری نوکِ مژہ پر نکلا

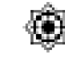
دھوپ دنیا کے مصائب کی جو محسوس ہوئی
تان کر سر پہ ترے غم کی میں چادر نکلا

کیا چھپا رکھا تھا ہاتھوں میں نجانے اس نے
پھول ہم جس کو سمجھتے تھے وہ پتھر نکلا

وہی تنہائی ہے بالکل وہی خاموشی ہے
جس کو صحرا میں سمجھتا تھا مرا گھر نکلا

بچ نکلنا ہے مرا ڈوب کے اب ناممکن
کتنا گہرا تری یادوں کا سمندر نکلا

ایسے آنکھوں سے مری اشکِ سحر ٹپکا ہے
جیسے پنچھی کوئی پنجرے سے ہو باہر نکلا



سب چین سکوں اپنے دلِ زار کا کھوکر
میں آج ہی آیا ہوں ترے شہر سے ہوکر

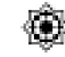
ہلکا نہ ہوا کچھ بھی غبارِ دلِ ویراں
دیکھا ہے بہت ہم نے ترے ہجر میں روکر

آنکھیں تو تری ویسی ہی بے آب پڑی ہیں
ہاتھ آیا مرے کیا ترے دامن کو بھگو کر

سینے میں ہے اک چیز کہ حساس بہت ہے
اس کانچ کے گلدان کو لگ جائے نہ ٹھوکر

کیا کیا نظر آئیں گے تمہیں درد کے پہلو
دیکھو تو سہی نشترِ غم دل میں چبھو کر

کاغذ پہ سحر کیسا مہک اٹھا ہے اک نام
لکھا ہے قلم نے اسے خوشبو میں ڈبو کر



ابھی جلاؤ نہ آنکھوں کے طاقچوں میں چراغ
کہ بجھ نہ جائیں کہیں بہتے پانیوں میں چراغ

ہے گھنگروؤں کی چھنک میں بڑے غضب کی چمک
چھپے ہوئے ہیں کئی تیری پائلوں میں چراغ

ہوا ہے کون شبستانِ دل میں جلوہ فگن؟
کہ جل اٹھے ہیں ہر اک سمت آئنوں میں چراغ

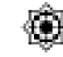
ہے اسکے قدموں تلے شب کی سرد تاریکی
لئے ہوئے ہے اگرچہ وہ بازوؤں میں چراغ

عجیب ظرف ہے ان باکمال لوگوں کا
جو بانٹتے ہیں ہواؤں کی جھولیوں میں چراغ

کھلے ہوئے ہیں ہمارے لبوں پہ درد کے پھول
جلے ہوئے ہیں ہماری ہتھیلیوں میں چراغ

انہی کے دم سے نئی رت میں روشنی ہو گی
جلا رہے ہیں جو تاریک موسموں میں چراغ

بھٹکنے دیں گے نہ شب کے مسافروں کو کبھی
سحر جلائے ہیں ہم نے جو راستوں میں چراغ



یہ کیا؟ منزل سے جیسے جیسے قربت بڑھتی جاتی ہے
مسافر کے لئے راہِ مسافت بڑھتی جاتی ہے

جہانِ نو کی تازہ روشنی کی جگمگاہٹ سے
بصیرت گھٹتی جاتی ہے بصارت بڑھتی جاتی ہے

ہمارے شہر پر سایہ کسی جنگل کا ہے شاید
مہذب ہو گئے اتنے کہ وحشت بڑھتی جاتی ہے

ہوئے ہیں محو اتنے انجمن آرائیوں میں ہم
ہمارے دل کے ویرانے میں خلوت بڑھتی جاتی ہے

گزرتا ہے جو اک سال اک ورق تحریر ہو جیسے
کتابِ زندگی کی یوں ضخامت بڑھتی جاتی ہے

سحر رنگِ تبسم جس قدر ہے عام ہونٹوں پر
دلوں کے درمیاں اتنی ہی نفرت بڑھتی جاتی ہے



اوڑھ کر سر پہ ترا ریشمی آنچل نکلی
رات آنکھوں میں لگائے ہوئے کاجل نکلی

آسماں پر نظر آئی جو چمکتی بجلی
رقص کرتی وہ ترے پاؤں کی پائل نکلی

نظر آتے تھے کئی نقش ادھورے لیکن
غور سے دیکھا تو تصویر مکمل نکلی

دور سے دل نظر آتا تھا بہت ہی بے آب
پاس پہنچے تو یہ بستی بڑی جل تھل نکلی

کبھی انجانے میں اپنائی تھی جو ہم نے سحر
سارے گلشن میں وہی طرزِ سخن چل نکلی



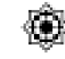
ذرہ و مہ میں مساوات نہیں ہو سکتی
آپ سے میری ملاقات نہیں ہو سکتی

وہ ہیں افلاک نشیں ہم ہیں سرِ خاک مکیں
اتنی دوری پہ کوئی بات نہیں ہو سکتی

لوگ بس نام چراغوں کا لئے جاتے ہیں
دُور یوں ظلمتِ حالات نہیں ہو سکتی

ہستیٔ رب کا بھی عرفان نہیں ہے ممکن
جب تلک معرفتِ ذات نہیں ہو سکتی

مرے پہلو میں ہے اک مہرِ جہاں تابِ سحر
مری دنیا میں کبھی رات نہیں ہو سکتی



دشت کو مجبوریوں میں گلستاں کہتے ہوئے
عمر گزری پتھروں کو کہکشاں کہتے ہوئے

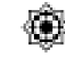
اسقدر ظلم و ستم ڈھائے زمیں نے دوستو!
ڈر رہا ہوں آسماں کو آسماں کہتے ہوئے

ہے کہاں وہ چین وہ آرام وہ آسودگی
سوچ میں ہوں آشیاں کو آشیاں کہتے ہوئے

غور سے دیکھا جو رخ بام و در و دیوار کا
رک گئے دل کے کھنڈر کو ہم مکاں کہتے ہوئے

وقت پڑنے پر ہوئے ثابت وہ دشمن جان کے
جن کو ہم تھکتے نہ تھے محبوبِ جاں کہتے ہوئے

جب سے دیکھی ہے تحیر بے انت دنیا روح کی
اک جھجک ہے بحر کو اب بیکراں کہتے ہوئے



ترے خیال سے شاداب ہو گیا ہوں میں
کہ جیسے ابر سے سیراب ہو گیا ہوں میں

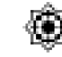
صدا وہ کیسی تھی صد رشکِ نغمۂ فردوس
کہ جس کو سنتے ہی بیتاب ہو گیا ہوں میں

اتر گیا ہے مری موج موج سے طوفاں
کبھی میں بحر تھا پایاب ہو گیا ہوں میں

نہیں ہے عکس کوئی مجھ میں چہرۂ غم کا
اک آئنہ تھا کہ بے آب ہو گیا ہوں میں

ہوا ہوں جب سے عبادت کی روح سے غافل
اسیرِ منبر و محراب ہو گیا ہوں میں

کسی کے حسن کا حاصل ہوا جو قربِ سحر
تو جیسے سایۂ مہتاب ہو گیا ہوں میں



غم کے پیچاک سے نہیں اترا
نشہ ہوں تاک سے نہیں اترا

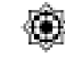
ہوں ابھی گردشِ مسلسل میں
میں ابھی چاک سے نہیں اترا

ایک بھی چاند میرے آنگن میں
اوجِ افلاک سے نہیں اترا

موسمِ گُل کے بعد بھی وہ رنگ
تیری پوشاک سے نہیں اترا

سیرِ دنیا میں ہوں ابھی مصروف
اشہبِ خاک سے نہیں اترا

نفرتوں کا سیاہ سایہ سحر
وطنِ پاک سے نہیں اترا



جن کا مزاج سنگ ہے وہ شیشہ گر بھی ہیں
کچھ لوگ کور چشم ہیں اور دیدہ ور بھی ہیں

عمریں گزار دی ہیں قفس کی فضاؤں میں
میں بھول ہی گیا تھا مرے بال و پر بھی ہیں

دن کو بھی روشنی کا جہاں سے گزر نہیں
اس جگمگاتے شہر میں کچھ ایسے گھر بھی ہیں

کیسے ملے گا منزلِ مقصود کا سراغ؟
رہزن ہیں جو وہی تو مرے راہبر بھی ہیں

عزت ہر ایک شخص کا مقسوم تو نہیں
دستار جن پہ تنگ ہو کچھ ایسے سر بھی ہیں

مایوس ہو نہ دیکھ کے شمعوں کا یہ دھواں
ہر رات کی جبیں پہ نشانِ سحر بھی ہیں



اب میں ہوں وہاں اور جہاں کوئی نہیں ہے
صد شکر یہاں اپنا نشاں کوئی نہیں ہے

اک در پہ مرے نام کی تختی ہے بھلا کیوں؟
اس شہر میں میرا تو مکاں کوئی نہیں ہے

لتھڑے ہوئے سب خوں میں سرِ خاک پڑے ہیں
جز میرے سرِ نوکِ سناں کوئی نہیں ہے

لب بستہ یہاں لوگ نظر آتے ہیں سارے
میں خوش ہوں کہ میری بھی زباں کوئی نہیں ہے

ملتا ہی نہیں وہ میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں
سب یار ہیں اور دشمنِ جاں کوئی نہیں ہے

چہرے سے مرے حرف ٹپکتے ہیں مسلسل
آنکھوں سے مگر اشک رواں کوئی نہیں ہے

یوں روشنی سینے میں ہے اک شعلۂ غم کی
جلتا ہے مگر اس کا دھواں کوئی نہیں ہے

کچھ لفظ ہیں ایسے کہ اتر جائیں دلوں میں
یہ تیر ہیں وہ جن کی کماں کوئی نہیں ہے

معلوم ہے مجھ کو کہ سزا ہی مجھے ہوگی
اب میرا عدالت میں بیاں کوئی نہیں ہے

سوچو تو سفرِ عمرِ رواں کا ہے بہت تیز
دیکھو تو مسافت کا گماں کوئی نہیں ہے

پہنا ہے سحر میں نے تو کانٹوں کا لبادہ
اب دل کو مرے خوفِ خزاں کوئی نہیں ہے



گو وصل کی مے کے ہیں نشے اور طرح کے
ہیں زہرِ جدائی کے مزے اور طرح کے

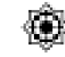
اپنوں سے شکایت کا یہ انداز نہیں ہے
ہوتے ہیں محبت میں گلے اور طرح کے

طاقوں میں جو جلتے ہیں وہ بجھنے کے لئے ہیں
جلتے ہیں ہواؤں میں دیئے اور طرح کے

اس بار تو پت جھڑ بھی نئے رنگ سے آئی
ہر شاخ سے پتے ہیں گرے اور طرح کے

پہلی سی وہ لذت ہے نہ پہلی سی خلش ہے
کانٹے ہیں مرے دل میں چبھے اور طرح کے

آئیں گے سحر یہ نہ کسی رت کے اثر میں
اس دل میں ہیں کچھ پھول کھلے اور طرح کے



جو سفر کی دھول تھی وہ قافلوں میں رہ گئی
ہم چلے آئے ہیں منزل راستوں میں رہ گئی

کیا غضب ہے ایک ہی بے ذائقہ سی کیفیت
زیست کے سب تلخ و شیریں ذائقوں میں رہ گئی

جانے کیسا خوف تھا جو بال و پر کے باوجود
دور تک اڑنے کی خواہش طائروں میں رہ گئی

آنکھوں آنکھوں میں کہا اس نے مجھے خوش آمدید
اور گلے ملنے کی حسرت بازوؤں میں رہ گئی

لب ترستے ہیں حقیقی زندگی کے رنگ کو
بے مزا خالی ہنسی اب قہقہوں میں رہ گئی

چھوڑ کر جن کے مکیں پردیس رخصت ہو گئے
اک اداسی اور خموشی ان گھروں میں رہ گئی

عمر کے شام و سحر کی تیرگی اور روشنی
گیسوؤں میں رہ گئی کچھ عارضوں میں رہ گئی



لبوں پر دشمنی کے تذکرے اچھے نہیں لگتے
سماعت کو یہ کڑوے ذائقے اچھے نہیں لگتے

مری آنکھوں میں ایسے جھلملاتے ہی رہیں آنسو
چراغوں سے یہ خالی طاقچے اچھے نہیں لگتے

انہیں جلتے ہوئے آندھی کے رخ کو موڑ دینا تھا
ہوا کی زد پہ یوں بجھتے دئے اچھے نہیں لگتے

کسی کے عہد کی ناپائداری یاد آتی ہے
یہ پانی پر ابھرتے بلبلے اچھے نہیں لگتے

تمہارا حال ہم سے بھی کہیں بدتر نہ ہو جائے
ذرا سوچو! تمہیں یہ قہقہے اچھے نہیں لگتے

ملے ہو اتنی مدت بعد پھر بھی وسوسوں میں ہو
یہ اپنوں سے تو اتنے فاصلے اچھے نہیں لگتے

بکھرتے عکس اپنی ذات کے جن میں نظر آئیں
ہمیں ایسے شکستہ آئنے اچھے نہیں لگتے

سحر کتنا عجب ہے حال اپنے دوستوں کا بھی
پرانے مل نہیں سکتے، نئے اچھے نہیں لگتے



دل میں تری یادوں کا نشاں بھی نہیں ملتا
جلتے ہوئے شعلوں کا دھواں بھی نہیں ملتا

دیکھو تو نظر آتے ہیں ہنستے ہوئے چہرے
سوچو تو مسرت کا گماں بھی نہیں ملتا

اس شہر میں ملتا نہیں اک دوست بھی اپنا
حد یہ ہے کوئی دشمنِ جاں بھی نہیں ملتا

میخانے میں تم کیفِ الم ڈھونڈ رہے ہو
یہ ایسا نشہ ہے کہ یہاں بھی نہیں ملتا

کس طرح کسی کو میں سحرؔ راہ دکھاؤں؟
مجھ کو تو مرا اپنا مکاں بھی نہیں ملتا

۞

اک سمندر ہے جو زخار مرے سامنے ہے
ان کا پیرایۂ گفتار مرے سامنے ہے

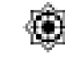
دے تو سکتا ہوں میں دشنامِ مخالف کا جواب
مرے اسلاف کا کردار مرے سامنے ہے

کس کی زلفوں کا تصور ہے مری راہوں میں؟
دور تک سایۂ اشجار مرے سامنے ہے

کوئی جچتا ہی نہیں آنکھ کو آسانی سے
حُسن کا آخری معیار مرے سامنے ہے

یہ ہٹے تو کہیں منزل کا نشاں حاصل ہو
اپنی ہی ذات کی دیوار مرے سامنے ہے

کون ہوں کیا ہوں میں کب سے ہوں کہاں ہوں میں سحرؔ
اک سوالات کا انبار مرے سامنے ہے



ان دیکھے خوشرنگ زمانے اچھے لگتے ہیں
سب کو آخر خواب سہانے اچھے لگتے ہیں

چپکے چپکے ہجر کی کالی رات کی تنہائی میں
آنکھوں سے یوں اشک بہانے اچھے لگتے ہیں

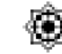
ان سے وابستہ ہیں بچپن کی معصوم ادائیں
دل کو سارے یار پرانے اچھے لگتے ہیں

لکھا نہیں انہوں نے جن کو میرے نام ابھی تک
ایسے خط اور مرے سرہانے اچھے لگتے ہیں

کانوں میں رس ٹپکاتے ہیں یادوں کے سازینے
اب بھی مجھ کو گیت پرانے اچھے لگتے ہیں

عادی ہیں جو لوگ حقائق کی سنگین فضا کے
ان کے ہونٹوں پر افسانے اچھے لگتے ہیں

سحر مٹا سکتے ہیں شعر بھی ذہنوں کی تاریکی
طاقوں میں کچھ دیپ جلانے اچھے لگتے ہیں



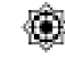
فلک پر اک ستارہ رہ گیا ہے
یہی بس اب سہارا رہ گیا ہے

مسافر آ گئے منزل پہ لیکن
سفر سارے کا سارا رہ گیا ہے

گلوں کو دیکھتے ہیں دور ہی سے
یہی بس حق ہمارا رہ گیا ہے

زمانے بھر کے سائل ہم رہے ہیں
فقط اک در تمہارا رہ گیا ہے

بہت آگے نکل آئے سحر ہم
بہت پیچھے کنارا رہ گیا ہے



اشک آنکھوں سے ٹپکتے نہیں دیکھے جاتے
شاخ سے ٹوٹتے پتے نہیں دیکھے جاتے

روشنی کی مری آنکھوں کو ہے عادت اتنی
مجھ سے ڈوبے ہوئے تارے نہیں دیکھے جاتے

میں نے دیکھا ہے بہاروں کا المناک مآل
اس لئے کھلتے شگوفے نہیں دیکھے جاتے

ایک بس ایک ہی میں عکس کا شیدائی ہوں
آئنے میں کئی چہرے نہیں دیکھے جاتے

مسکراتے ہوئے یہ پھول ہیں اچھے لگتے
مجھ سے روتے ہوئے بچے نہیں دیکھے جاتے

جاگتی آنکھوں سے آتے ہیں نظر خوابِ حیات
بند آنکھوں سے یہ سپنے نہیں دیکھے جاتے

کوئی خوشبو نہ صدا ہے نہ کوئی رنگ سحر
ہم سے ویران دریچے نہیں دیکھے جاتے



خلوص کی بے بہا فضاؤں میں آ گیا ہوں
میں چھوڑ کر اپنا شہر گاؤں میں آ گیا ہوں

قریب ان گیسوؤں کے آیا تو یوں لگا ہے
تمازتوں سے نکل کے چھاؤں میں آ گیا ہوں

میں چاہتا ہوں ثبات و ہمت کو آزمانا
عجب دیا ہوں جو یوں ہواؤں میں آ گیا ہوں

ابھی میں نکلا ہی تھا ترے حسن کے اثر سے
کہ پھر تری دلفریب اداؤں میں آ گیا ہوں

جو مشکلوں میں گھرا تو یاد آ گیا کہ شاید
پھر اپنے احباب کی دعاؤں میں آ گیا ہوں

بھلا کے تجھ کو یہ آج محسوس ہو رہا ہے
کہ جیسے میں خود بھی بے وفاؤں میں آ گیا ہوں

سحرؔ مقدر کی بات ہے کیا گلہ کروں میں؟
بہار دیکھی نہیں خزاؤں میں آ گیا ہوں



کہنے کو عام ہے یہ مگر کس کے پاس ہے؟
آنکھیں ہیں سب کے پاس نظر کس کے پاس ہے؟

چل تو رہے ہیں منزلِ مقصود کو سبھی
یہ دیکھنا ہے زادِ سفر کس کے پاس ہے؟

ساحل پہ سوچتا ہوں بڑی دیر سے کھڑا
ہے سیپ میرے پاس گہر کس کے پاس ہے؟

وہ کون ہے جو صاحبِ عزت ہے اصل میں
دستار سب کے پاس ہے سر کس کے پاس ہے؟

دیوار و در میں جس کے ہو اپنائیت سحرؔ
ایسا نگر میں ایک بھی گھر کس کے پاس ہے؟



موم کے انداز کیسے پتھروں میں آ گئے؟
سوچتا ہوں پھول کیسے خنجروں میں آ گئے؟

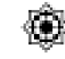
آسمانوں پر دھنک کے عکس جب اڑنے لگے
رقص کرتے نقش تتلی کے پروں میں آ گئے

اب بہاروں اور خزاؤں میں نہیں کچھ امتیاز
ایک جیسے رنگ سارے منظروں میں آ گئے

اب کہاں باقی زمانے میں نظر کا اعتبار؟
بے بصر جتنے تھے سب دیدہ وروں میں آ گئے

قافلوں کی خیر یا رب منزلوں کی خیر ہو
رہزنوں کے وصف سارے رہبروں میں آ گئے

ریزہ ریزہ ہو گئے خوابوں کے آئینے سحرؔ
پتھروں کے طور جب شیشہ گروں میں آ گئے



مشکل ہے گرچہ کام یہ کرنا مجھے بھی ہے
اس شہر بے وفا سے گزرنا مجھے بھی ہے

گزری ہوئی بہار کی خوشبو ہوں دوستو!
برگِ خزاں کے ساتھ بکھرنا مجھے بھی ہے

وہ پھول ہے تو خوف ہے اس کو ہواؤں کا
شبنم ہوں میں شعاعوں سے ڈرنا مجھے بھی ہے

میں ہوں فلک کے خون کی سرخی شفق نہیں
سورج کے ساتھ ساتھ ابھرنا مجھے بھی ہے

تنہا حباب بن کے تجھے ٹوٹنا نہیں
ساحل کی ریت ہوں میں بکھرنا مجھے بھی ہے

خود سے یہ کہہ رہی ہے ہر اک بوند سانس کی
پیمانۂ حیات کو بھرنا مجھے بھی ہے

وہ تو مکر گیا ہے سحر اپنی بات سے
میں کس طرح کہوں کہ مکرنا مجھے بھی ہے



اس کی کوئی مثال نہ دیکھوں تو کیا کروں؟
پھر قریۂ خیال نہ دیکھوں تو کیا کروں؟

ملتا نہیں ہے آنکھ کو معیار حسن کا
میں اس کے خدوخال نہ دیکھوں تو کیا کروں؟

فردا و دوش میرے نہیں اختیار میں
اب سوئے عہدِ حال نہ دیکھوں تو کیا کروں؟

اُڑنے کے واسطے مرے پر ہی نہیں رہے
خوابوں میں اپنے جال نہ دیکھوں تو کیا کروں؟

دہلیزِ شام اب ہے سحر سامنے مرے
میں منظرِ زوال نہ دیکھوں تو کیا کروں؟



ہم سے تلاطم آشنا لوگ جدھر جدھر گئے
موجیں مچل مچل اٹھیں دریا بپھر بپھر گئے

حسن کو اپنے دھیان میں کس کا خیال آ گیا؟
چہرہ چمک چمک اُٹھا گیسو سنور سنور گئے

چمکا ہے کس کا عکس یہ آئینۂ خیال میں
مطلعِ فکر پر کئی چاند ابھر ابھر گئے

جانے وہ ایسی کونسی بات تھی خاص راز کی
کہہ کے جسے وہ بار بار آج مکر مکر گئے

بیٹھے ہی تھے ابھی سحر غم سے ذرا سنبھل کے ہم
تیر پھر ان کی یاد کے دل میں اتر اتر گئے

❁

کہاں دریا کوئی جو چشمِ پرنم کے برابر ہو
کوئی ساغر نہیں جو ساغرِ جم کے برابر ہو

کوئی تو بات ایسی ہو کہ ہو وجہِ سکونِ جاں
کوئی تو ایسا نشتر ہو جو مرہم کے برابر ہو

کسی بھی غم کو ایسی پائداری ہے کہاں حاصل؟
کوئی بھی غم نہیں جو اک ترے غم کے برابر ہو

کوئی بالشتیا ہے شہر میں باون گزا کوئی
نہیں ہے ایک بھی جو قدِ آدم کے برابر ہو

سحر دل میں ہمیشہ ہے مرے غم کی ہی کیفیت
کوئی موسم نہیں جو ایسے موسم کے برابر ہو



جوت دل کی آنکھ کے دھاروں میں کیسے آ گئی؟
روشنی گھر کی تھی بازاروں میں کیسے آ گئی؟

ایک سناٹا تھا چھایا کوچہ و بازار پر
یہ خموشی گھر کی دیواروں میں کیسے آ گئی؟

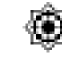
ان کے لہجے میں یہ تبدیلی اچانک کس طرح؟
پھول سی خنکی یہ انگاروں میں کیسے آ گئی؟

رت بدلتے ہی چمن میں خاک اڑاتی ہے ہوا
دشت کی میراث گلزاروں میں کیسے آ گئی؟

آنکھ لب دل وقف ہو کر رہ گئے غم کے لئے
یہ کہانی ڈھل کے کرداروں میں کیسے آ گئی؟

رقص کرتی وحشتیں ہیں چیختی تنہائیاں
عہدِ نو کی نسل پھر غاروں میں کیسے آ گئی؟

چڑھتے سورج کے پجاری ہیں سحر اب اہلِ فن
مکر کی عادت یہ فنکاروں میں کیسے آ گئی؟



یہ عجب بات ہے دن جیسے گزرتے جائیں
خود بخود زخم ترے ہجر کے بھرتے جائیں

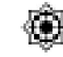
اس سے پہلے کہ کبھی ڈوبنا پڑ جائے ہمیں
کچھ ستاروں کی طرح ہم بھی ابھرتے جائیں

کوہساروں کی طرح بات پہ ہم قائم ہیں
کس طرح کر کے کوئی بات مکرتے جائیں

کیسے الفاظ ہیں یہ آج ترے ہونٹوں پر
تیر بن کر جو مرے دل میں اترتے جائیں

ہم پشیماں رہیں ہر جرم و خطا پر اپنے
اور ناکردہ گناہوں سے بھی ڈرتے جائیں

ایک اک کر کے جدا ہو گئے احباب سحرؔ
خشک پتے ہیں کہ شاخوں سے بکھرتے جائیں



سبھی اطوار اور عادات پیچھے چھوڑ آئے ہیں
ہم اپنا آپ اپنی ذات پیچھے چھوڑ آئے ہیں

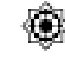
چلے آئے ہیں ہم تپتے ہوئے صحراؤں میں لیکن
کسی کی آنکھ میں برسات پیچھے چھوڑ آئے ہیں

ہمیں آتا نہیں ہے یاد کچھ بھی دھوپ نگری میں
گھنیرے گیسوؤں کی رات پیچھے چھوڑ آئے ہیں

نظر آتے ہیں منزل پر مسافر مطمئن ایسے
کہ جیسے گردشِ حالات پیچھے چھوڑ آئے ہیں

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دل ہی نہیں رکھتے
کسی کے پیار کی سوغات پیچھے چھوڑ آئے ہیں

گھرے ہیں ہم سحرِ نفرت کے احساسات میں ہر سو
محبت کے حسیں جذبات پیچھے چھوڑ آئے ہیں



روشن ہوئے ہوا میں جو بجھتے ہوئے چراغ
کم ہمتوں کو دیں گے نئے حوصلے چراغ

پھیلی ہوئی تھی چاروں طرف جن کی روشنی
سارے نگر میں آج وہی گھر ہیں بے چراغ

آنکھوں سے جگمگاتے ہوئے اشک ہیں رواں
یا آبشار میں ہیں یہ بہتے ہوئے چراغ

جلنا ہے اپنے بس میں نہ بجھنے کا اختیار
ہم طاقِ زندگی پہ ہیں رکھے ہوئے چراغ

چاروں طرف فضا میں اجالا سا چھا گیا
شب کی سیاہیوں پہ جو کھل کر ہنسے چراغ

یہ ہے ہماری آبلہ پائی کا معجزہ
ہر گام پر جو دشت میں ہیں جل اٹھے چراغ

بڑھنے لگی ہے اور بھی کچھ جن سے تیرگی
محفل میں آ گئے ہیں کچھ ایسے نئے چراغ

شامل نہیں ہے میرے قبیلے میں وہ کبھی
ظلمت کو بھی جو اپنے قلم سے لکھے چراغ

ان سے ملے گا منزلِ مقصود کا نشاں
رہ میں جلا گئے ہیں جو یہ قافلے چراغ

کس کا خیال آیا کہ تاریکیاں ہٹیں
آیا ہے کس کا نام کہ جلنے لگے چراغ

تارے ہیں یا ہیں پھول سے کھلتے ہوئے سحر
جگنو ہیں یا فضا میں ہیں اڑتے ہوئے چراغ



دل میں تھی جو چھپی وہ خوشی کون لے گیا؟
اس شاخ پر کھلی تھی کلی کون لے گیا؟

کس شعلہ رو نے دھوپ بکھیری ہے چار سو
اک برف سی تھی دل پہ جمی کون لے گیا؟

بے آب ہو گئے ہیں جزیرے نگاہ کے
آنکھوں سے آنسوؤں کی نمی کون لے گیا؟

یہ آج کیا ہوا مجھے اک چپ سی لگ گئی
ہونٹوں سے کھلکھلاتی ہنسی کون لے گیا؟

یادوں کا اک نشاں بھی نہیں دل میں اے سحرؔ
بستی سی اک یہاں تھی بسی کون لے گیا؟



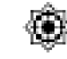
گم سفر کی دھول میں سب راستے کیسے ہوئے!
آشنا منزل سے پھر بھی قافلے کیسے ہوئے!

ایک اک کر کے ہوا سے گل دیئے کیسے ہوئے
اسقدر ویران سارے طاقچے کیسے ہوئے!

زندگی کیوں اسقدر بے کیف ہو کر رہ گئی
ایک جیسے تلخ و شیریں ذائقے کیسے ہوئے؟

اب تو پہچانی نہیں جاتی ہے صورت شہر کی
یہ ہمارے بعد اتنے حادثے کیسے ہوئے؟

ایک ہی مٹی کی ہم تخلیق ہیں لیکن سحر
مختلف فکر و نظر کے زاویئے کیسے ہوئے؟



روشنی ہو تیرگی ہو سب ہیں بھاری ایک سی
دن ہیں سارے ایک سے راتیں ہیں ساری ایک سی

عاشقوں کے ہے مقدر میں کہ وہ روتے رہیں
آنسوؤں کی ہر جگہ ندی ہے جاری ایک سی

چشم و دل پر ہے ہمارے ایک ہی جلوے کا رنگ
آئنوں میں بٹ گئی صورت تمہاری ایک سی

اس کا ہر تحفہ ہمیں ہے جان سے بڑھ کر عزیز
رنج ہو راحت ہو ہر حالت ہے پیاری ایک سی

دیکھ کر یہ کون کہتا ہے کہ ہم دو شخص ہیں
ہیں جدا قالب مگر جاں ہے ہماری ایک سی

اک اداسی ایک ویرانی سی چھائی ہے سحر
شہرِ دل پر اب تو کیفیت ہے طاری ایک سی



بھرا ہوا تھا جو جامِ حباب ٹوٹ گیا
تمام طنطنۂ سطحِ آب ٹوٹ گیا

وہ رشکِ برق تھا چہرہ کہ دیکھتے ہی جسے
غرورِ نجم و مہ و آفتاب ٹوٹ گیا

گزر گیا ہے کئی خشک کھیت ترساتا
سمندروں پہ اُمنڈتا سحاب ٹوٹ گیا

کسی کی زلف میں سجنے کی آرزو لے کر
لچکتی شاخ سے تازہ گلاب ٹوٹ گیا

سحر گھرا تھا جو اپنی ہی ذات کے اندر
بالآخر اُس پہ انا کا عذاب ٹوٹ گیا



ہر اک دھڑکتے دل میں محبت بدن کی ہے
ہر اک چمکتی آنکھ میں حسرت بدن کی ہے

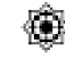
اس کا وجود میری نظر میں ہے اس طرح
گویا کتابِ روح میں آیت بدن کی ہے

دنیائے آب و گِل پہ تسلط ہے جسم کا
گھیرے ہوئے زمین کو وسعت بدن کی ہے

جو سنگ کو گداز کرے موم کی طرح
ساری حرارتوں میں حرارت بدن کی ہے

دل ہے نگار خانۂ نقش و نگارِ حسن
اس آئنے میں ایک ہی حیرت بدن کی ہے

کرتی ہے طے سفر جو لہو بن کے ساتھ ساتھ
سر تا قدم سحر وہ رفاقت بدن کی ہے



کہیں عمرِ رواں کا کچھ پتا باقی نہیں رہتا
کہ اس رہ میں کوئی بھی نقشِ پا باقی نہیں رہتا

یہ ملنے میں دلوں کے درمیاں اتنا تکلف کیوں؟
محبت میں تو کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا

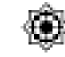
جوانی میں کہاں رہتا ہے کوئی ہوش دنیا کا ؟
اس آندھی میں کوئی جلتا دیا باقی نہیں رہتا

ذرا کچھ سوچ لیں عالم پنہ ! اس حکم سے پہلے
حکومت کا ہمیشہ تو نشہ باقی نہیں رہتا

ضروری ہے غموں کی آب دل کے واسطے ہردم
چمک جس میں نہ ہو وہ آئینہ باقی نہیں رہتا

اک ایسا وقت بھی راہِ طلب میں آ ہی جاتا ہے
کہ جب لب پر کوئی حرفِ دعا باقی نہیں رہتا

خزاں کی دھوپ ہر سو گھیر لیتی ہے سحران کو
گلوں کے سر پہ گر دستِ صبا باقی نہیں رہتا



یہ آنکھ مری اشک فشاں ہے کہ نہیں ہے؟
بے حرف وصدا میرا بیاں ہے کہ نہیں ہے؟

ہلکی سی ذرا ٹھیس لگی ٹوٹ گئے دل
یہ کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ نہیں ہے؟

ملاح بھی دشمن تھا ہوا بھی تھی مخالف
کشتی مری دریا میں رواں ہے کہ نہیں ہے؟

اس درجہ بہاروں کا تسلسل ہے چمن میں
یہ سوچ رہا ہوں میں خزاں ہے کہ نہیں ہے؟

شہرِ خواب

دن رات سلگتے ہیں مکیں آتشِ غم میں
اٹھتا ہوا ہر گھر سے دھواں ہے کہ نہیں ہے؟

اک سر کہ جو کٹ کر بھی ہے مشغولِ تلاوت
قرآں یہ سرِ نوکِ سناں ہے کہ نہیں ہے؟

ہم کو تو یقیں ہے کہ جدا ہو نگے ہم اک دن
تجھ کو بھی بچھڑنے کا گماں ہے کہ نہیں ہے؟

ہیں غیر سحر میرے لئے سب در و دیوار
بستی میں کوئی میرا مکاں ہے کہ نہیں ہے؟

قفس کی تنگ فضاؤں میں سانس لیتے ہیں
ہم اپنی اپنی اناؤں میں سانس لیتے ہیں

کڑکتی دھوپ نے جھلسا کے رکھ دیا ہم کو
کسی کی زلف کی چھاؤں میں سانس لیتے ہیں

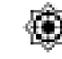
رسائی عرش علا تک ہے ان پرندوں کی
جو حرف ماں کی دعاؤں میں سانس لیتے ہیں

ہمارے حلق میں کانٹے ہیں پیاس کے مارے
سمندروں کی ہواؤں میں سانس لیتے ہیں

نئی بہار کی خوشبو کے ہیں پیامی ہم
یہ اور بات خزاؤں میں سانس لیتے ہیں

ہمارا اپنی زمیں سے نہیں کوئی رشتہ
کہ جیسے دور خلاؤں میں سانس لیتے ہیں

ہمارے لب پہ صدائیں ہیں قہقہوں کی سحر
اگرچہ غم کی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں



بھول جاتا ہے جس کا نام ہمیں
یاد آتا ہے صبح و شام ہمیں

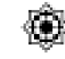
ذہن آزاد دل بھی ہے آزاد
کیسے رکھے گا وہ غلام ہمیں؟

جس سے ہم بات بھی نہ کرتے تھے
اس کو کرنا پڑا سلام ہمیں

دور رہتے تھے جس کے سائے سے
پڑ گیا ہے اسی سے کام ہمیں

آگہی کی جو روشنی بخشے
ایسی مستی نہیں حرام ہمیں

تلخیوں سے سحر ہے یوں معمور
زندگی زہر کا ہے جام ہمیں



یوں مرے دیدۂ تر جلتے ہیں
جیسے برسات میں گھر جلتے ہیں

دشت کی دھوپ میں وہ شدت ہے
اپنی چھاؤں میں شجر جلتے ہیں

جب بھی سوچوں مَیں سراپا تیرا
مری تخیّل کے پر جلتے ہیں

آگ ہر موج کی یوں بھڑکی ہے
عین دریا میں بھنور جلتے ہیں

سر سکوں میں ہیں تو تن ہیں بیتاب
تن ہیں خاموش تو سر جلتے ہیں

نام کس شعلہ بدن کا لکھا
حرف کاغذ پہ سحر جلتے ہیں



عیاں ہے دل کا فسانہ بیان سے پہلے
کہ اشک بول اٹھے ہیں زبان سے پہلے

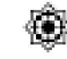
شروع اخیر کے سارے ورق شکستہ ہیں
کتابِ عمر پڑھیں درمیان سے پہلے

بڑھیں تو کیسے بڑھیں ہم بلندیوں کی طرف
کشش زمین کی ہے آسمان سے پہلے

بھڑکتی آگ مرے دل کی بجھ بھی سکتی ہے
مکین نکلیں تو سارے مکان سے پہلے

اسے خبر تھی کہ رونا پڑے گا آخر میں
ہنسایا خوب ہمیں داستان سے پہلے

سفینہ بازوئے ساحل کو چھو ہی لے گا سحر
ہوا کا رُخ بھی تو ہو بادبان سے پہلے



یونہی نور کا سلسلہ چل رہا ہے
ابھی تک دیے سے دیا جل رہا ہے

اندھیرا ہے شب کا جو ہر سمت چھایا
کسی آنکھ کا کل یہ کاجل رہا ہے

وہیں چاند یادوں کا نکلا ہے پھر سے
خیالوں کا سورج جہاں ڈھل رہا ہے

بیابان دل کا ہے سنسان کتنا
کبھی یہ صداؤں کا جنگل رہا ہے

تری یاد چھائی رہی ہے دلوں پر
سروں پر ہمارے یہ بادل رہا ہے

زر و سیم ہے کارسازِ زمانہ
ہر اک مسئلے کا یہی حل رہا ہے

سحر آج دشتِ تمنا ہے ویراں
کبھی ابرِ غم سے یہ جل تھل رہا ہے



جو اُس کے در پہ رسائی بہت ضروری ہے
تو دل کی راہ نمائی بہت ضروری ہے

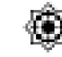
خرد کے الجھے مسائل کا حل سمجھنے کو
جنوں کی عقدہ کشائی بہت ضروری ہے

وصال و قرب کی لذت ابھارنے کے لئے
کبھی کبھی تو جدائی بہت ضروری ہے

نجانے کب سے در و بامِ شہر ویراں ہیں
کسی کی جلوہ نمائی بہت ضروری ہے

جو دل میں چاہتے ہو عکسِ جلوۂ جاناں
اس آئنے کی صفائی بہت ضروری ہے

دلوں کی برف سحر یوں پگھل نہیں سکتی
زباں کی شعلہ نوائی بہت ضروری ہے



اشکوں سے اپنی آنکھ کو تر کر رہے ہیں ہم
آبِ بقا سے اپنا سبو بھر رہے ہیں ہم

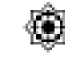
زیرِ قدم بس ایک ہی رستے کی خاک ہے
اک دائرے میں گویا سفر کر رہے ہیں

اس پیکرِ حیات میں ڈھلنے سے پیشتر
صدیوں کسی چٹان کے اندر رہے ہیں ہم

کیا ہے کھلی فضاؤں میں اُڑنے کی کیفیت
ہم جانتے نہیں ہیں کہ بے پر رہے ہیں ہم

لمحہ بہ لمحہ سانس ہمارے ہیں گھٹ رہے
لمحہ بہ لمحہ جیسے کہیں مر رہے ہیں ہم

اپنے تو اختیار میں کچھ بھی نہیں سحرؔ
شاید کسی کی عمر بسر کر رہے ہیں ہم



نفرت سے پُر سیاہ گھٹاؤں کے درمیاں
ہم جی رہے ہیں کیسی فضاؤں کے درمیاں

ان کی طرف جو ضد ہے تو اپنی طرف بھی ضد
دونوں گھرے ہوئے ہیں اناؤں کے درمیاں

دنیا و دیں کا خوف بھی اس کا خیال بھی
اک دل ہے کتنے فرماں رواؤں کے درمیاں

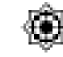
کل تک بجھی ہوئی تھیں جو طاقوں کی گود میں
وہ شمعیں جل رہی ہیں ہواؤں کے درمیاں

کس طرح ہو بہار کی خوشبو سے آشنا
وہ پھول جو کھلا ہو خزاؤں کے درمیاں

گم کر چکے ہیں منزلِ مقصود کا نشاں
جب سے گھرے ہیں راہ نماؤں کے درمیاں

اپنی زمین کا بھی انہیں چاہیے خیال
جو سیر کر رہے ہیں خلاؤں کے درمیاں

ہم کو نہیں سفر کے مصائب کا ڈر سحرؔ
رخصت ہوئے ہیں ماں کی دعاؤں کے درمیاں



یہ کیا؟ کہ اس سے جدائی کے خواب دیکھتے ہیں
ہم آج اپنی رہائی کے خواب دیکھتے ہیں

جنہیں شعور نہیں منزل و مسافت کا
ستم ہے راہ نمائی کے خواب دیکھتے ہیں

انہیں نہیں ہے کسی تاج و تخت کی حاجت
جو اس کے در کی گدائی کے خواب دیکھتے ہیں

نہیں ہے اپنے مسائل کی بھی خبر جن کو
جہاں کی عقدہ کشائی کے خواب دیکھتے ہیں

جو آئنے کے کبھی سامنے نہ آتے تھے
وہ اپنی جلوہ نمائی کے خواب دیکھتے ہیں

وہ بت جو ہم نے تراشے تھے اپنے ہاتھوں سے
غضب ہے آج خدائی کے خواب دیکھتے ہیں

نہیں ہے جن کو سحر اختیار خود پر بھی
جہاں پہ فرماں روائی کے خواب دیکھتے ہیں



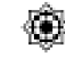
بنوں میں رہتے ہوئے گلشنوں میں رہتے ہوئے
حیات گزری ترے مسکنوں میں رہتے ہوئے

وہی دکھائی دیا آج بے تعلق سا
زمانہ گزرا جسے دھڑکنوں میں رہتے ہوئے

کہیں ہم ان کو برا کس زبان سے یارو !
ہمارے دوست ہیں وہ دشمنوں میں رہتے ہوئے

کہیں کہیں نظر آتا ہے حُسن کا جلوہ
دکھائی دیتے ہیں وہ چلمنوں میں رہتے ہوئے

کہاں شعورِ سحر اس کو راہ و منزل کا؟
ہو جس کی عمر کٹی رہزنوں میں رہتے ہوئے



ہر اک آنسو بیاں سے کم نہیں ہے
خموشی بھی زباں سے کم نہیں ہے

رفاقت ہو جو حاصل ہم صفیرو !
قفس بھی آشیاں سے کم نہیں ہے

بظاہر نقشِ پا ہے دیکھنے میں
مگر یہ کہکشاں سے کم نہیں ہے

گماں بھی کم نہیں ہے کچھ یقیں سے
یقیں بھی کچھ گماں سے کم نہیں ہے

اگر عزمِ سفر تازہ ہو دل میں
مسافر کارواں سے کم نہیں ہے

یہاں کچھ لوگ رشکِ مہرومہ ہیں
زمیں بھی آسماں سے کم نہیں ہے

بچھڑنے والے رخصت چاہتے ہیں
یہ لمحہ امتحاں سے کم نہیں ہے

سحر گر غنچۂ دل ہو شگفتہ
بیاباں گلستاں سے کم نہیں ہے



ہمیشہ درد سے سیراب رکھا
دل اس کی موج سے شاداب رکھا

نہیں ممکن کوئی تعبیر جس کی
سجا کر آنکھ میں وہ خواب رکھا

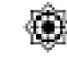
نہ آنکھوں سے بہایا اشک غم کو
چھپا کر ہم نے یہ سیلاب رکھا

بچا کر لائے تھے جس کو جہاں سے
وہی سجدہ سرِ محراب رکھا

کبھی ڈوبے نہیں ہیں ذات میں ہم
ہمیشہ خود کو ہے پایاب رکھا

وہ کیسا شوق تھا آوارگی کا
کہ جس نے عمر بھر بیتاب رکھا

سحر تازہ رکھا ذہن و نظر کو
کھلا یوں روح کا ہر باب رکھا



نئی صورت میں ڈھلتا جا رہا ہوں
میں ہر لمحہ بدلتا جا رہا ہوں

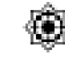
سہاروں کی نہیں مجھ کو ضرورت
میں گر گر کر سنبھلتا جا رہا ہوں

کشش کوئی لئے جاتی ہے جیسے
تری حد سے نکلتا جا رہا ہوں

نہیں کوئی خبر منزل کی مجھ کو
مگر پھر بھی میں چلتا جا رہا ہوں

مسلسل چاک پر گردش میں ہوں میں
ترے ہاتھوں میں ڈھلتا جا رہا ہوں

ہوا کا رخ سحر اپنا لیا ہے
میں طوفاں میں بھی جلتا جا رہا ہوں



واقف نہیں وہ کیا ہے بہاروں کا پیرہن
جس گل نے اوڑھ رکھا ہو خاروں کا پیرہن

تجھ کو شبِ سیاہ کی ظلمت کا کیا پتا؟
زیبِ بدن ہے تیرے ستاروں کا پیرہن

ہے ڈوبنا ہمارے مقدر میں لازمی
موجوں کے جسم پر ہے کناروں کا پیرہن

جس کو پہن کے آدمی ننگِ لباس ہو
وہ پیرہن ہے آج بھی غاروں کا پیرہن

افسردگی ہے شہر کے لوگوں پہ اس طرح
زندوں کے تن پہ جیسے مزاروں کا پیرہن

کچھ فرق اب رہا نہیں اپنے پرائے میں
پہنا ہے دشمنوں نے بھی یاروں کا پیرہن

میں ڈگمگا رہا ہوں ہر اک گام پر سحرؔ
اوڑھا ہے جب سے میں نے سہاروں کا پیرہن



ہم اپنے گھر کا رستہ بھول کر صحرا میں آ نکلے
بجھانے پیاس اپنی ریت کے دریا میں آ نکلے

کبھی چہرے بھی دیتے ہیں کھلا دھوکا نگاہوں کو
تلاش دوستاں تھی ہم صف اعدا میں آ نکلے

ہزاروں وسوسوں نے شہرِ دل پامال کر ڈالا
کہاں کفار صحنِ مسجدِ اقصیٰ میں آ نکلے؟

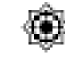
زمانے کا سفر گویا سفر اک دائرے کا ہے
گئے جو شہرِ ماضی میں درِ فردا میں آ نکلے

ٹھکانہ ہی نہیں کوئی ہمارا مستقل یارو !
کبھی گلشن میں آ نکلے کبھی صحرا میں آ نکلے

تمنا تھی نہ خواہش تھی نہ تھی کوئی غرض ہم کو
تماشا دیکھنے بازی گہِ دنیا میں آ نکلے

چراغِ درد تھے ہم کو تو جلنا تھا الگ رہ کر
شبستاں سے چلے اپنے دلِ تنہا میں آ نکلے

غزل کہنے کو جب فکرِ سخن کی ہے سحر ہم نے
غلام الفاظ تھے جو خدمتِ آقا میں آ نکلے



یوں نظر آتا ہے یہ نام کسی اور کے ہیں
اپنے ہاتھوں میں جو ہیں جام کسی اور کے ہیں

اپنی قسمت کو جو دیکھا تو کھلا ہے ہم پر
اضطراب اپنے ہیں آرام کسی اور کے ہیں

عدل فرمائیں سزا دینے سے پہلے مجھ کو
جو مرے سر ہیں وہ الزام کسی اور کے ہیں

غور سے جھانک کے دیکھا ہے تری آنکھوں میں
ان دریچوں میں تو پیغام کسی اور کے ہیں

اجنبیت سی برستی ہے فضائے دل پر
جیسے اس گھر کے در و بام کسی اور کے ہیں

اس کی زلفوں کی طرح ابر نہیں سایہ فگن
یہ تو گیسوئے سیہ فام کسی اور کے ہیں

گرچہ ہم اس کے غلاموں میں ہیں شامل لیکن
مانتے ہم ہیں جو احکام کسی اور کے ہیں

بے ارادہ جو بسر کرتے ہیں ہم مدت سے
ماہ و سال اور سحر و شام کسی اور کے ہیں



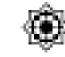
زندگی دریا کی خاموشی بھی ہے طوفان بھی
مسئلہ ہے ذات کا دشوار بھی آسان بھی

وہ ہمارے ذکر سے دامن چھڑا سکتا نہیں
ہم گواہی بھی ہیں اسکی اور ہیں پہچان بھی

ایک مدت بعد بھی کمرہ مرا بدلا نہیں
ہے وہی تصویر بھی اسکی وہی گلدان بھی

یاد کرنے پر بھی اب تو یاد وہ آتا نہیں
بھول جانے کا نہ تھا جس کے ذرا امکان بھی

صرف آنکھوں کے دریچے ہی نہیں کافی سحر
روشنی کو کھول دیجے دل کا روشندان بھی



شکستِ دل کے ہیں آثار مختلف سب سے
کہ اس کے ہیں درو دیوار مختلف سب سے

بہار میں بھی رہی دل کی شاخ شاخ تہی
مرے چمن کے ہیں اشجار مختلف سب سے

محبتوں کا نہ آغاز ہے نہ ہے انجام
ہیں اس کہانی کے کردار مختلف سب سے

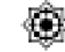
حریف ساتھ لئے چل رہا ہوں منزل کو
سفر میں ہے مرا ایثار مختلف سب سے

عدو کو اپنا بناتا ہوں ایک وار سے میں
ہے میرے ہاتھ میں تلوار مختلف سب سے

جو مجھ کو بھول گیا اس کو یاد کرتا ہوں
مری وفا کا ہے معیار مختلف سب سے

کبھی ہم اس کی تجلی میں ڈوب کر دیکھیں
ہیں اپنی ذات کے انوار مختلف سب سے

سحر وہ خود کو سناتا ہے سب سے چھپ چھپ کر
مری غزل کے ہیں اشعار مختلف سب سے



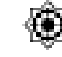
اس نے گنگ جوابوں کی تصویر بنا رکھی ہے
رخ پر بند کتابوں کی تصویر بنا رکھی ہے

زخمِ وفا لوگوں کو سمجھانے کی خاطر میں نے
تازہ سرخ گلابوں کی تصویر بنا رکھی ہے

ہوش میں رہنا ہو تو اس کی آنکھوں کو مت تکنا
اس نے مست شرابوں کی تصویر بنا رکھی ہے

ایک مصور نے دیکھی ہے یوں اس کی پیشانی
کاغذ پر مہتابوں کی تصویر بنا رکھی ہے

قدم قدم پر سحر ہیں بھٹکے عمر کے صحراؤں میں
دل نے کئی سرابوں کی تصویر بنا رکھی ہے



کبھی جو لوٹ کے گھر سے مکالمہ کرتے
ہر اک دریچہ و در سے مکالمہ کرتے

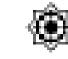
ہماری آنکھ کو آتی کبھی جو گویائی
تو ہم بھی ان کی نظر سے مکالمہ کرتے

کہیں زبان جو ملتی ہمارے اشکوں کو
تو اپنے دیدۂ تر سے مکالمہ کرتے

جو بول سکتے کہیں یہ ادھورے فن پارے
کمالِ دستِ ہنر سے مکالمہ کرتے

ہمارے ہاتھ جو اٹھتے نہ آسماں کی طرف
دعا کے حرف اثر سے مکالمہ کرتے

اگر نہ ہوتے کبھی اتنے شب گزیدہ ہم
ضرور نجمِ سحر سے مکالمہ کرتے



محبتوں میں ہوا اپنا حال سب سے الگ
فراق سب سے الگ تھا وصال سب سے الگ

عجیب کرب کا عالم عجیب کیف نشاط
خوشی جدا ہے ہماری ملال سب سے الگ

علاجِ ظلمتِ شب کے لئے دکھا اعجاز
کوئی قمر کوئی تارا اچھال سب سے الگ

جواب بھی مجھے اس کا ملے جدا سب سے
کیا ہے میں نے جو تجھ سے سوال سب سے الگ

ہے رنگِ ظلم میں بھی التفات کی خوشبو
ستم گری میں ہے اُس کی مثال سب سے الگ

ہمارے قصے کا آغاز تھا جدا سب سے
ہوا اسی لئے اپنا مآل سب سے الگ

مرے سخن کی سحر مختلف ہے کیفیت
ہے مرے دشت کا اک اک غزال سب سے الگ

کیا کیا اپنی دھن میں باتیں کرتی ہیں
مجھ سے اس کی آنکھیں باتیں کرتی ہیں

اس کی زلفوں پر شاموں کا سایہ ہے
جس کے رخ پر صبحیں باتیں کرتی ہیں

ہجر کے ماروں کا بھی ہے معمول عجب
دن خاموش ہیں راتیں باتیں کرتی ہیں

کیا معلوم یہ بجھنے والی شمعوں کو؟
کیا کیا تیز ہوائیں باتیں کرتی ہیں؟

سر پہ کڑکتی دھوپ اگر چھا جاتی ہے
دھیان میں اس کی زلفیں باتیں کرتی ہیں

کہاں ہے منزل کس جانب ہیں قدم سحرؔ
ہر راہی سے راہیں باتیں کرتی ہیں



کب سے رواں ہیں آج تو تھک جانا چاہیے
چلتے ہوئے ذرا سا بھٹک جانا چاہیے

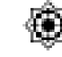
یہ کیا کہ ہولے ہولے سلگتے رہیں سدا؟
اک بار آگ بن کے بھڑک جانا چاہیے

دل میں ہوائے شوق ہے ہر سو رواں دواں
اس گُل کو اب تو خوب مہک جانا چاہیے

خاموش دل رہے گا ہمارا کہاں تلک؟
سینے میں اس کے اب تو دھڑک جانا چاہیے

حد سے گزر چکی ہے شبِ غم کی تیرگی
سورج کو اب سروں پہ چمک جانا چاہیے

اتنی بھی احتیاط مناسب نہیں سحرؔ
آنکھوں سے اشکِ غم کو ٹپک جانا چاہیے



کھلتی ہوئی شاخوں پہ کلی کیوں نہیں آتی؟
باغوں میں ابھی رُت وہ ہری کیوں نہیں آتی؟

دل میں تو مرے درد کا پھیلا ہے سمندر
حیران ہوں آنکھوں میں نمی کیوں نہیں آتی؟

سن کر جسے شاخوں پر چٹک اٹھتی ہیں کلیاں
بچوں کے لبوں پر وہ ہنسی کیوں نہیں آتی؟

ہوں شہر کے رستوں پہ رواں کب سے مسلسل
حیرت ہے ابھی تک وہ گلی کیوں نہیں آتی؟

رہزن تو ہے مشاق بہت اپنے ہنر میں
رہبر کو مگر راہبری کیوں نہیں آتی؟

ہر سمت ہے بستی میں چراغاں ہی چراغاں
ظلمت میں سحر کوئی کی کیوں نہیں آتی؟



آنکھوں میں کہیں اشکوں کا کوئی سیلاب بلا لڈا ہی نہ ہو
ہم جس کو سمجھتے ہیں ٹھہرا وہ بہتا ہوا دریا ہی نہ ہو

جب غور کریں تو ہر شے کا روشن پہلو بھی ہوتا ہے
میں جس کو برا کہتا ہوں کہیں وہ حق میں مرے اچھا ہی نہ ہو

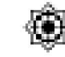
شاید مجھے اپنے بارے میں ہو ایک غلط فہمی اب تک
میں جس کو بھلا بیٹھا ہوں کہیں وہ دل میں مرے رہتا ہی نہ ہو

جو میرا گماں ہے ممکن ہے وہ عین حقیقت بن جائے
میں جیسا سمجھتا ہوں اسکو وہ شخص کہیں ویسا ہی نہ ہو

سچ ہے کہ ہماری آنکھیں بھی اکثر ہمیں دھوکہ دیتی ہیں
جو محفل آرا ہے سب میں وہ شخص کہیں تنہا ہی نہ ہو

منہ پھیر کے جانے کا اس سے کیوں آج ہمیں شکوہ ہے بہت
ہو سکتا ہے راہ چلتے ہوئے کل اس نے ہمیں دیکھا ہی نہ ہو

یہ اس کی آنکھوں کی سرخی یہ اس کے چہرے کی زردی
ممکن ہے کئی راتوں سے سحر وہ میری طرح سویا ہی نہ ہو



ہم رواں ہوتے ہیں کب اُس کی طرف؟
راستے جاتے ہیں سب اُس کی طرف

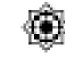
اپنی منزل کے لئے ہے جا رہا
کاروانِ روز و شب اس کی طرف

مل گیا اُمید سے بڑھ کر کہیں
جب بڑھا دستِ طلب اس کی طرف

چاہتے ہیں روح کی سیرابیاں
دیکھتے ہیں تشنہ لب اس کی طرف

کون ہے میری گواہی کے لئے؟
ہیں یہاں تو سب کے سب اس کی طرف

عکس اپنا ہی نظر آیا سحر
غور سے دیکھا ہے جب اس کی طرف



زمین بھول گئے آسمان بھول گئے
ہم اپنی ذات کے سارے نشان بھول گئے

نئی فضا میں نیا خوف تھا پرندوں کو
پروں کے ہوتے ہوئے بھی اڑان بھول گئے

اگرچہ طاق ہیں ہم تو بہ نو زبانوں میں
مگر جو ماں نے سکھائی زبان بھول گئے

نشاط و عیش میں جو ہر قدم پہ ساتھی تھے
مصیبتوں میں وہی مہربان بھول گئے

شہرِ خواب

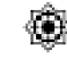
وہ سامعین کے اشکوں میں کھو گئے ہوں گے
جو کہتے کہتے مری داستان بھول گئے

ہمارا حافظہ کیا ہے؟ کتابِ ہستی کا
شروع اخیر نہیں درمیان بھول گئے

نئی زمین کی تھی دھوپ میں کشش ایسی
کہ اپنے دیس کے ہم سائباں بھول گئے

ستم ظریفیٔ حالات ہی کہیں اس کو
کہ نام رہتا تھا جو حرزِ جان بھول گئے

سحر بھٹکتے ہوئے ہر گلی میں پھرتے ہیں
ہم اپنے شہر میں اپنا مکان بھول گئے



کون کہتا ہے کہ پوشاک سلامت رہ جائے؟
بس گریبان کا اک چاک سلامت رہ جائے

جب شب و روز ہیں رفتارِ زمیں کے در پے
کس لئے گردشِ افلاک سلامت رہ جائے؟

دل کے چو گرد ہے اب تازہ غموں کی یورش
کاش موجوں سے یہ خاشاک سلامت رہ جائے

گرچہ ہوں بے سر و سامان مگر چاہتا ہوں
مرے دشمن پہ مری دھاک سلامت رہ جائے

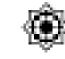
بے بسی کی وہ ہوا ہے کہ رواں ہے ہر سو
یہ مرا دیدۂ نمناک سلامت رہ جائے

بارشِ سنگِ جنوں ہے کہ ہے جاری ہر دم
اے خدا شیشۂ ادراک سلامت رہ جائے

اپنے ہاتھوں سے اڑاتا ہوں میں خاک اپنی ہی
شاید اس طرح مری خاک سلامت رہ جائے

کعبۂ دل میں تمناؤں کے اصنام نہ پوچھ
یہ مری مملکتِ پاک سلامت رہ جائے

چاہے چھن جائے دہن سے یہ زباں میری سحرؔ
اک مرا لہجۂ بیباک سلامت رہ جائے



چاند چراغ ستارے جگنو میرے ہیں
تاریکی سے لڑتے بازو میرے ہیں

ہر سینے کی آہ کا رشتہ مجھ سے ہے
ہر اک آنکھ سے بہتے آنسو میرے ہیں

خوش بھی ہوں میں خود سے اور بیزار بھی ہوں
اپنی ذات کے کتنے پہلو میرے ہیں

اس کے قرب میں وقت ہے میری مٹھی میں
صبح کے عارض شام کے گیسو میرے ہیں

کانٹے تو پہچان ہیں میرے دشمن کی
پھول جو پھیلاتے ہیں خوشبو میرے ہیں

سحرؔ قبیلۂ اہلِ محبت ہے میرا
سچلؔ اور رحمانؔ اور باہوؔ میرے ہیں

شکست و فتح کے معنی بدل بھی سکتے ہیں
ابھرتے ہی کئی خورشید ڈھل بھی سکتے ہیں

یقیں کی اب بھی حرارت اگر میسر ہو
ضمیر پر ہیں جو پتھر پگھل بھی سکتے ہیں

ہمیشہ ایک سے حالات رہ نہیں سکتے
گرے ہیں آج اگر کل سنبھل بھی سکتے ہیں

اگر ہو واقعی موجود جذبۂ صادق
چراغ تیز ہواؤں میں جل بھی سکتے ہیں

پڑے جو وقت تو زندانِ دہر کے قیدی
حدودِ شام و سحر سے نکل بھی سکتے ہیں



رات کے اندھیروں میں کیسے خواب میرے ہیں؟
روشنی کی لہروں میں بہتے خواب میرے ہیں

کوئی بھی نہیں شامل دوسرے کی خواہش میں
تیرے خواب تیرے ہیں میرے خواب میرے ہیں

ان کی تہہ میں اکثر میں ڈوب ڈوب جاتا ہوں
بیکراں سمندر سے گہرے خواب میرے ہیں

یہ بتا نہیں سکتیں میری ادھ کھلی آنکھیں
میرے سارے خوابوں میں کتنے خواب میرے ہیں

ظلم اور نفرت سے میرا کیا سحر رشتہ؟
امن اور محبت کے سارے خواب میرے ہیں

❁

اندھیری شب میں جگنو جاگتے ہیں
کہ سناٹوں میں گھنگرو جاگتے ہیں

نگاہیں دیکھنے والی اگر ہوں
تری آنکھوں میں جادو جاگتے ہیں

بیاں ہوتا ہے سب احوال دل کا
زباں چپ ہو تو آنسو جاگتے ہیں

اگر سوئی ہوں گلشن کی فضائیں
تو غنچے بن کے خوشبو جاگتے ہیں

زبانیں کاٹ دی جائیں سحر جب
یکایک دست و بازو جاگتے ہیں



بغور ظلمتِ شب کا بیان سنتے ہیں
کہ خامشی کی ہے اپنی زبان سنتے ہیں

فضا میں پھیلی ہوئی ہیں جو کب سے چار طرف
وہ ان سنی سی صدائیں یہ کان سنتے ہیں

چلو سنائیں ستاروں کو ہجر کا احوال
زمیں تو سنتی نہیں آسمان سنتے ہیں

تمام ہیں در و دیوار گوش برآواز
مکیں اگر نہ ہوں، خالی مکان سنتے ہیں

جسے نہ لفظ بیاں کر سکیں وضاحت سے
تو آنسوؤں سے وہی داستان سنتے ہیں

کہاں شعور ہے سننے کا ناخداؤں کو؟
ہوا کی بات مگر بادبان سنتے ہیں

سماعتوں میں جو پیدا کرے گداز سحر
حریمِ روح کی ہم وہ اذان سنتے ہیں

❁

آنکھوں کو جب تلک نہ ملے تیرگی کا لمس
ممکن نہیں کبھی کہ ملے روشنی کا لمس

خوشبو کسی کی یاد کی چھو کر گزر گئی
اور مجھ کو دے گئی وہ نئی زندگی کا لمس

میں نے جو اپنے ہونٹ سمندر پہ رکھ دیئے
پایا وہاں عجیب سی اک تشنگی کا لمس

مانوس ایک لہر لہو میں ہے تیرتی
پاتا ہے آدمی جو کسی آدمی کا لمس

میں نے کبھی چھوا تھا کسی رشکِ ماہ کو
ہاتھوں میں اب تلک ہے مرے چاندنی کا لمس

کانٹے غمِ حیات کے چبھتے ہیں یوں سحر
خون ریز برچھیوں کی ہو جیسے انی کا لمس



اس کو کیا معلوم؟ کیا ہے آرزو کا ذائقہ؟
جس نے چکھا ہی نہیں اپنے لہو کا ذائقہ

حسن ہے ناآشنا خود آگہی کے لطف سے
پھول نے دیکھا کہاں ہے رنگ ربو کا ذائقہ؟

ہر نفس ہے اک مسلسل عزم کی لذت سے پُر
زندگی کیا ہے؟ فقط ہے جستجو کا ذائقہ

زیست کی سب تلخیاں شیرینیوں میں ڈھل گئیں
ہم نے جب پایا کبھی دل کے سبو کا ذائقہ

ہم نے جب بھی خواہش ابر بہاراں کی سحر
اپنے ہونٹوں پر کیا محسوس لُو کا ذائقہ



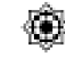
گر نہیں سکتا کبھی حالات کی آغوش میں
جو پلا ہو رات دن آفات کی آغوش میں

ہر گھڑی بہتے ہوئے اشکوں سے مجھ کو کام ہے
دن گزرتے ہیں مرے برسات کی آغوش میں

منکشف ہوتے ہیں مجھ پر رازہائے کائنات
جب بھی آتا ہوں میں اپنی ذات کی آغوش میں

روح جب ہو جائے زخمی خنجرِ آلام سے
چین ملتا ہے کہاں نغمات کی آغوش میں

وقت کی تہہ میں جو ہم اترے ہوا محسوس یوں
کتنی صدیاں ہیں سحر لمحات کی آغوش میں



یہ جو ننھا سا دیا ہے شام کی دہلیز پر
ایک لمحے کی ضیا ہے شام کی دہلیز پر

آسماں پر اک ستارہ کانپتا ہے خوف سے
ظلمتوں کا سامنا ہے شام کی دہلیز پر

اک کرن جھک کر یہ کہتی ہے حدِ آفاق سے
چاند دستک دے رہا ہے شام کی دہلیز پر

خشک پتوں کے کھڑکنے کی جو آتی ہے صدا
اک عجب شورِ ہوا ہے شام کی دہلیز پر

ایک اک لمحہ بیاں کرتا ہے دن کا حال سب
خامشی کی اک صدا ہے شام کی دہلیز پر

اک دیا بجھنے کو ہے طاقِ شفق کی گود میں
اک دیا جلنے لگا ہے شام کی دہلیز پر

چپ کوئی آواز دیتی ہے کہ ہے آواز چپ
غور سے سنتے ہیں کیا ہے؟ شام کی دہلیز پر

یہ جو اک جگنو چمکتا ہے اندھیرے میں سحر
شب کے آنے کا پتا ہے شام کی دہلیز پر



اس طرح ٹوٹے ہیں شیشے خواب کے
روح تک چبھتے ہیں ریزے خواب کے

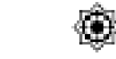
جاگتی آنکھوں میں کاجل کی طرح
ہر طرف پھیلے ہیں سائے خواب کے

جل رہے ہیں بھیگی پلکوں پر چراغ
جگمگا اٹھے ہیں رستے خواب کے

آنکھ سے آنسو مسلسل ہیں رواں
پھوٹتے ہیں کیسے چشمے خواب کے

ہم کبھی سیراب ہو سکتے نہیں
ہم ہمیشہ سے ہیں پیاسے خواب کے

چاندنی سی دل میں بکھری ہے سحر
کون یہ اترا ہے زینے خواب کے؟



روح کچھ ایسے ہے پوشاک بدن اوڑھے ہوئے
پھول ہو جس طرح خوشبوئے چمن اوڑھے ہوئے

ہر طرف ہے پھر دھنک کے شوخ رنگوں کی بہار
موسم آیا ہے کسی کا پیرہن اوڑھے ہوئے

پا نہیں سکتی ہماری گرد کو بھی اب خرد
مدتیں گزریں ہمیں دیوانہ پن اوڑھے ہوئے

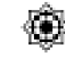
کل وہ مدت بعد بھی ہم کو ملا اس طور سے
اپنے ماتھے پر تھا نفرت کی شکن اوڑھے ہوئے

بدگمانی کی ہوائیں ہم کو چھو سکتی نہیں
ہم تو پھرتے ہیں ابھی تک حسن ظن اوڑھے ہوئے

اس کے ہونٹوں پر تبسم اس طرح ہے جلوہ ریز
برگِ گل جیسے ستاروں کی کرن اوڑھے ہوئے

عکس ہے مجھ میں یہ سب آئینہ حالات کا
اک ردائے کرب ہے جو میرا فن اوڑھے ہوئے

وقت نے بدلیں ہزاروں کروٹیں لیکن سحر
دل ابھی تک ہے وہی یادِ کہن اوڑھے ہوئے



میرے آئینے کی ہر تصویر اس کے پاس ہے
خواب میرے پاس ہیں تعبیر اس کے پاس ہے

اس کی نظروں میں عجب ہے کیمیا کا سا اثر
میں سراسر خاک ہوں اکسیر اس کے پاس ہے

کب وہ میری ذات کے اک ایک ریزے کو چنے
منتظر ہوں میں ،میری تعمیر اس کے پاس ہے

جب بھی چاہے وقت کو کر لے وہ مٹھی میں اسیر
اڑتے لمحوں کے لئے زنجیر اس کے پاس ہے

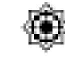
اس کے میرے درمیاں ہیں فاصلے ہی فاصلے
شب ہے میرے پاس اور تنویر اس کے پاس ہے

وہ بنا سکتا ہے اب مجھ کو نشانہ بے خطر
میرے ہی ترکش کا اک اک تیر اس کے پاس ہے

خود پہ جو اترا رہا ہے آج میرے سامنے
میری ہی بخشی ہوئی تو قیر اس کے پاس ہے

اپنے ہر نفع و ضرر کا آپ ہی مختار ہوں
کون کہتا ہے مری تقدیر اس کے پاس ہے؟

کس طرح ممکن ہے میری کامیابی اب سحرؔ؟
پاس ہے میرے دعا تاثیر اس کے پاس ہے



زمیں کو دور سے یوں آسماں آواز دیتا ہے
کسی کو جیسے کوئی ہم زباں آواز دیتا ہے

چمن میں خشک پتوں کے کھڑکنے کی صدا سن کر
گلوں کے دور کو عہدِ خزاں آواز دیتا ہے

میں کھو جاتا ہوں اپنی ذات کے جب بھی حصاروں میں
مجھے میرے ہی ہونے کا نشاں آواز دیتا ہے

صدائیں گونجتی رہتی ہیں دیواروں سے ٹکرا کر
مکینوں سے ہو کر خالی، مکاں آواز دیتا ہے

اندھیری شب کے سناٹے میں اک ویراں دریچے سے
صداؤں کا مجھے اک کارواں آواز دیتا ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے پکاروں جب سحر اس کو
کہ جیسے ساتھ میرے اک جہاں آواز دیتا ہے



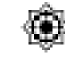
فصلِ گل مٹھی میں ہے عہدِ خزاں مٹھی میں ہے
دیکھئے تو اُس کی سارا گلستاں مٹھی میں ہے

میرے قدموں میں ہے مٹی کوچۂ دلدار کی
ہے زمیں مٹھی میں میری، آسماں مٹھی میں ہے

سامنے اس کے ادا ہوتا نہیں اک حرف بھی
کیسے کہہ سکتا ہوں میں میری زباں مٹھی میں ہے

آشنا ہے وہ ہواؤں کے مزاجِ سخت سے
ناخدا ایسا ہے جس کی بادباں مٹھی میں ہے

ایک رشکِ مہر و مہ پہلو میں میرے ہے سحرؔ
ایسے لگتا ہے کہ جیسے کہکشاں مٹھی میں ہے



کب زر و لعل و گہر باندھ رکھے ہیں ہم نے؟
جیب میں حرف ہنر باندھ رکھے ہیں ہم نے

ڈوبنے سے ہمیں اب کون بچا سکتا ہے؟
اپنے پیروں میں بھنور باندھ رکھے ہیں ہم نے

پاؤں اٹھتے ہی نہیں راہ نوردی کے لئے
اسقدر زحمتِ سفر باندھ رکھے ہیں ہم نے

ہم کو معلوم ہے کتنی ہے فضا کی وسعت
بس یہی سوچ کے پر باندھ رکھے ہیں ہم نے

نہیں پردیس میں بھی دیس سے ہم دور کبھی
ہر گھڑی دوش پہ گھر باندھ رکھے ہیں ہم نے

شاخ در شاخ ہیں یوں پھول گریزاں ہم سے
جیسے ہاتھوں پہ شرر باندھ رکھے ہیں ہم نے

آسمانوں کی طرف دستِ دعا کیوں اٹھیں؟
اپنے لفظوں میں اثر باندھ رکھے ہیں ہم نے

سر بھی گر جائیں گے دستار کے گرتے ہی سحر
جیسے دستار میں سر باندھ رکھے ہیں ہم نے



قوت ہے کہاں قوت کردار سے بڑھ کر؟
وار ایسا نہیں کوئی بھی اس وار سے بڑھ کر

ہے ایسے قبیلے سے تعلق مرا جس میں
سر قابلِ عزت نہیں دستار سے بڑھ کر

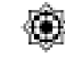
الفاظ کی دولت سے نہیں بڑھ کے کوئی شے
نعمت نہیں کوئی لبِ گفتار سے بڑھ کر

حاصل جو ہوا ہے ہمیں اپنوں کی زباں سے
کاری ہے بہت زخم پہ تلوار سے بڑھ کر

گھر ہوتا نہیں سنگ و گِل و خشت سے منسوب
اک اور بھی شے ہے در و دیوار سے بڑھ کر

کہتا ہے خموشی سے یہ آنکھوں کا تکلم
انکار ہے تیرا کسی اقرار سے بڑھ کر

کہنے کو سحر دل پہ مرے غم کی ہے یورش
تنہا ہے یہ اک لشکرِ جرار سے بڑھ کر



ساحلِ چشم سے خوناب اترتا ہی نہیں
کیسی بستی ہے کہ سیلاب اترتا ہی نہیں

مجھ کو معلوم نہیں چاندنی کیا ہوتی ہے؟
مرے آنگن میں تو مہتاب اترتا ہی نہیں

سچ زمانے کو گوارا نہیں ہوتا ہرگز
حلق سے ساغرِ زہراب اترتا ہی نہیں

صاحبِ مال کوئی ہو بھی تو قارون نہ ہو
ذہن سے نشۂ اسباب اترتا ہی نہیں

سطحِ دریا ہی پہ ہے حشر بپا موجوں کا
تہہ میں تو خنجرِ گرداب اترتا ہی نہیں

کب سے ہم جاگتی آنکھوں کو لئے بیٹھے ہیں
آسمانوں سے کوئی خواب اترتا ہی نہیں

مسکراتے ہوئے چہروں نے چھپایا لیکن
رنگِ بے مہریٔ احباب اترتا ہی نہیں

صرف ہے گوشِ سماعت میں سحر گونج اس کی
روح میں نغمۂ مضراب اترتا ہی نہیں



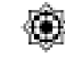
ترے در پر ہوا بن کر بکھرنا چاہتا ہوں میں
مجھے اتنی محبت ہے کہ مرنا چاہتا ہوں میں

غموں میں کود جانے کا مجھے کچھ شوق ہے اتنا
کہ اس دریا کی لہروں سے گزرنا چاہتا ہوں میں

جو خوشبو دیکھنا چاہے مجھے وہ اک نظر دیکھے
لہو کے رنگ میں ایسے نکھرنا چاہتا ہوں میں

کبھی ترکِ تعلق پر بھی ملنا چاہتا ہے دل
کبھی حرفِ وفا کہہ کر مکرنا چاہتا ہوں میں

اگرچہ لفظ ہوں لیکن سحر اک تیری صورت
کسی دل میں خموشی سے اترنا چاہتا ہوں میں



یوں خداداد یہ دولت نہیں حاصل ہوتی
مانگنے سے کبھی عزت نہیں حاصل ہوتی

اوجِ قامت کے لئے اور ہی پیمانے ہیں
قد بڑھانے سے تو رفعت نہیں حاصل ہوتی

اتنے مصروف ہوئے عشق کے ہم کاموں میں
ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں حاصل ہوتی

دل وہ گوہر ہے کہ انمول ہی بک جاتا ہے
اور خریدار سے قیمت نہیں حاصل ہوتی

یہی کافی ہے کہ ہیں محوِ نظارہ آنکھیں
بات کرنے کی اجازت نہیں حاصل ہوتی

اتنی آسان نہیں ناموری دنیا میں
ایک ہی رات میں شہرت نہیں حاصل ہوتی

دل کا اخلاص ضروری ہے محبت کے لئے
مفت دشمن کی بھی نفرت نہیں حاصل ہوتی

سر کٹانا بھی رہِ حق میں ضروری ہے سحر
جان دینے سے شہادت نہیں حاصل ہوتی



میں یوں اپنی شکستِ ذات کا منظر اٹھا لایا
کہ شیشے چھوڑ کر ہاتھوں میں کچھ پتھر اٹھا لایا

لگی تھی آگ گھر میں ہر طرف تو بدحواسی میں
جو باہر تھا میں وہ سامان بھی اندر اٹھا لایا

فضاؤں میں کچھ اتنا شوق تھا پرواز کا مجھ کو
ملا جب اذن اڑنے کا تو ٹوٹے پر اٹھا لایا

سرِ محشر ہماری مغفرت ہونے ہی والی تھی
فرشتہ ناگہاں اعمال کا دفتر اٹھا لایا

گئے تہہ میں سبھی لیکن مقدر اپنا اپنا تھا
کوئی گوہر اٹھا لایا کوئی کنکر اٹھا لایا

نظر کے سامنے جب ایک سیلابِ بلا دیکھا
تو میں اس کے مقابل اپنی چشمِ تر اٹھا لایا

جہاں تعبیر کے ملبوس کی تقسیم جاری تھی
وہاں خوابوں کا اپنے میں بھی اک پیکر اٹھا لایا

سخن کے آستانے کی سحر رونق بڑھانے کو
خیالوں کے صنم الفاظ کا آذر اٹھا لایا

ترے جمال کی تابش میں رہنا چاہتے ہیں
ہمیشہ ہم تری خواہش میں رہنا چاہتے ہیں

اے ماہتاب تری چاندنی کے منکر بھی
ترے ہی ہالۂ تابش میں رہنا چاہتے ہیں

خرد کے جہل کی تاریکیوں سے بچ کر ہم
جنوں کے حلقۂ دانش میں رہنا چاہتے ہیں

ترے فراق کی حدت سے تپ رہے ہیں ہم
ترے وصال کی بارش میں رہنا چاہتے ہیں

ہمارا دل ترے قرب و جوار میں ہے کہیں
ہم اپنے دل کی رہائش میں رہنا چاہتے ہیں

ہمیں عزیز جدائی ہے قرب سے بڑھ کر
اسی لئے تو اس آتش میں رہنا چاہتے ہیں

سحرؔ کبھی تو وہ تنقید سے بھی واقف ہوں
سدا جو داد و ستائش میں رہنا چاہتے ہیں



نہ سورج جگمگاتا ہے نہ تارے جگمگاتے ہیں
ہماری ذات کے اپنے نظارے جگمگاتے ہیں

ہمیں موجوں کی ظلمت کی نہیں یکسر کوئی پروا
ہمارے سامنے جب تک کنارے جگمگاتے ہیں

ہماری پیاس کی شدت کا یہ کیسا مداوا ہے
سرِ دشتِ نظر کچھ آبپارے جگمگاتے ہیں

خموشی کی فضا میں جب کلی کوئی چٹکتی ہے
تو گویا شاخ پر خوشبو کے دھارے جگمگاتے ہیں

جلا کر راکھ کر ڈالا ہے گو اس کے تغافل نے
مگر اس راکھ میں کچھ کچھ شرارے جگمگاتے ہیں

فضا میں چاندنی پھیلا رہے ہیں یہ بہاروں کی
کسی کے کان میں جو گوشوارے جگمگاتے ہیں

ہمارے لب پہ اس کا نام آتا ہے سحر جب بھی
نظر میں روشنی کے استعارے جگمگاتے ہیں



نشۂ عہدِ جوانی سے نکل کر دیکھیے
موجِ دریا کی روانی سے نکل کر دیکھیے

ایک بحرِ بیکراں امکان کا ہو گا عیاں
اس حبابِ آسمانی سے نکل کر دیکھیے

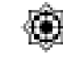
دشمنوں کے خار ہوں گے چار سو تنقید کو
دوستوں کی گُل فشانی سے نکل کر دیکھیے

کیسے کیسے ممکناتِ نَو کا ہو گا سامنا
زندگی کی رایگانی سے نکل کر دیکھیے

مرکزی کردار ہو گا آپ کا سب سے جدا
روز مرّہ کی کہانی سے نکل کر دیکھیے

سامنے دے گا سنائی تیز رو چشموں کا شور
جھیل کے خاموش پانی سے نکل کر دیکھیے

اپنے ہی اسلوب میں ہو گا بیاں اپنا سحر
دوسروں کی ترجمانی سے نکل کر دیکھیے



جلووں سے کسبِ نور جو کرنے نہیں دیا
صد حیف میرا ساتھ نظر نے نہیں دیا

جاتے ہوئے وہ اور بھی اک وار کر گیا
پہلا ابھی جو زخم تھا بھرنے نہیں دیا

چھینا ہے بڑھ کے موج تلاطم کے ہاتھ سے
ہم نے گہر کو تہہ میں اترنے نہیں دیا

حائل رہی ہمارے سفر میں ہماری ذات
اڑنے ہمیں ہمارے ہی پر نے نہیں دیا

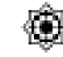
مشغول زندگی نے رکھا ہے ادھر ادھر
کرنے کا جو بھی کام تھا کرنے نہیں دیا

لکھا نہیں قصیدہ کسی بادشاہ کا
ہم نے قلم کی روح کو مرنے نہیں دیا

دانستہ اس نے جیت کا موقع عطا کیا
ہرنے کے وقت بھی مجھے ہرنے نہیں دیا

خوش فہمیوں نے رکھا سدا آسمان پر
ہم کو کبھی زمیں پہ اترنے نہیں دیا

رنج والم کے سائے ہیں دردوالم کی دھوپ
کیا کچھ ہمیں بھی شام وسحر نے نہیں دیا



مر جائیں نہ کیوں آج کہ مرنا ہے کسی دن
اس رہ سے بہر حال گزرنا ہے کسی دن

حالات کو اک رنگ میں رہنا نہیں آتا
اس زلفِ پریشاں کو سنورنا ہے کسی دن

ان ڈوبنے والوں کو نہ افسوس سے دیکھو
گرداب سے ہی ان کو اُبھرنا ہے کسی دن

دو ٹوک کوئی بات بھلا کیسے کہی جائے
معلوم ہے جب ہم کو مکرنا ہے کسی دن

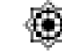
ہرنے کا ذرا سا بھی ملال آئے نہ دل میں
جیتے ہوئے لوگوں کو بھی ہرنا ہے کسی دن

مایوس نہیں اس کے رویے سے کبھی ہم
چڑھتے ہوئے دریا کو اترنا ہے کسی دن

مل بیٹھیں نہ کیوں آج ہی جی بھر کے بھلا پھر
پتوں کی طرح ہم کو بکھرنا ہے کسی دن

چلتے ہیں مسلسل جو شب و روز مسافر
آخر انہیں منزل پہ ٹھہرنا ہے کسی دن

کیوں آج نہ ہم بڑھ کے سحر اُن کو منا لیں
یہ کام بھی آخر ہمیں کرنا ہے کسی دن



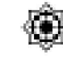
کسی کی یاد کو لے کر صبا تو آئے گی
کھلا رہا جو دریچہ ہوا تو آئے گی

رہیں خموش اگرچہ ہزار لب، لیکن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا تو آئے گی

کھڑک رہے ہیں جو پتے ہوا کے چلتے ہی
گزرتے لمحوں کی آواز پا تو آئے گی

ہوائے شام چلی ہے تو شمع یادوں کی
اگر جلا نہ سکے گی بجھا تو آئے گی

کسی کے دھیان میں دل جگمگا رہا ہے سحر
طلوعِ مہر اگر ہے ضیا تو آئے گی



کہا کس نے کہ ہم ہیں اپنے بام و در سے وابستہ؟
مسافر کب بھلا ہوتے ہیں اپنے گھر سے وابستہ؟

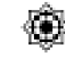
ہمارے سر کی کچھ عزت نہیں دستار کے دم سے
ہے سب دستار کی عزت ہمارے سر سے وابستہ

دلِ طائر میں ہونی چاہئے پرواز کی خواہش
اڑانیں کب فقط ہوتی ہیں بال و پر سے وابستہ

چھلکتا ہے ہمارا جامِ دل بھی گریۂ غم سے
ہمارے اشک کب ہیں صرف چشمِ تر سے وابستہ

اسی کی چاندنی سے ہے منور ایک اک منظر
ہمارے خواب ہیں بس ایک ہی پیکر سے وابستہ

فقط حسنِ سخن ہی باعثِ توقیرِ انساں ہے
صدف کی ساری قیمت ہے آخر گوہر سے وابستہ



نظارہ جمال کسی نے نہیں کیا
یہ کام تھا محال کسی نے نہیں کیا

اپنے پرائے زخم ہی دیتے رہے مگر
زخموں کا اندمال کسی نے نہیں کیا

جس کا کوئی جواب کسی سے نہ بن پڑے
ایسا کوئی سوال کسی نے نہیں کیا

صد شکر وسوسوں سے ہے محفوظ دل مرا
یہ شہر پائمال کسی نے نہیں کیا

جس کو زوال کا نہ کبھی خوف ہو سکے
ایسا کوئی کمال کسی نے نہیں کیا

جتنا مرے عدو نے کیا ہے مرا خیال
اتنا مرا خیال کسی نے نہیں کیا

میں خود ہی اپنے آپ کا صید و اسیر ہوں
مجھ کو تو یرغمال کسی نے نہیں کیا

وہ کتنا بدنصیب ہے مرنے کے بعد بھی
جس کا کوئی ملال کسی نے نہیں کیا

اس عاشقی نے حال جو میرا کیا سحر
ایسا کسی کا حال کسی نے نہیں کیا



وہ یاد آئیں اگر ہم بھلانے لگتے ہیں
چراغ جلتے ہی اس کو بجھانے لگتے ہیں

جلے ہوئے ہیں کہیں بام و در کہیں دیوار
ہمیں تو اپنے ہی یہ آشیانے لگتے ہیں

عجب طلسم ہے یہ بھی پرانی یادوں کا
چراغ دل میں کئی جگمگانے لگتے ہیں

کبھی جو نام نہ ہونٹوں پہ آ سکے ان کا
ہم اپنا نام ہی خود گنگنانے لگتے ہیں

وفا و مہر و مروت کی بات کیا کیجے
نئے جہاں میں یہ قصے پرانے لگتے ہیں

یہ مرحلہ ہے بھلا اپنی عمر کا کیسا؟
کہ اپنے لکھے ہوئے خط پرانے لگتے ہیں

جو دیکھتے ہیں سلوک اپنے دشمنوں کا سحر
پرانے دوست ہمیں یاد آنے لگتے ہیں



ہے آئنے پہ یہ کیا گردِ ماہ و سال کے ساتھ؟
عجیب نقش ہیں اپنے ہی خد و خال کے ساتھ

رواں لہو ہے مرا دھڑکنوں کی تال کے ساتھ
عجیب عالمِ مستی ہے اِس دھمال کے ساتھ

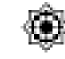
مرے وجود کی کرچی بھی ہاتھ نہ آ سکی
مجھے شکست ہوئی ہے عجیب چال کے ساتھ

پرانے زخم ہرے ہو رہے ہیں کیوں پھر سے؟
نئی جراحتیں شاید ہیں اندمال کے ساتھ

خوشی کے ساتھ یہ کیسا ہے خوف انجانا
فراق کا کوئی لمحہ بھی ہے وصال کے ساتھ

خوشی سے خود ہی پرندے شکار ہونے لگے
شکاریوں نے یہ پھیلایا کیا ہے جال کے ساتھ

کہیں بھی آنکھ میں آنسو نظر نہیں آتے
سخن ہیں گریہ کناں ہم کچھ اس کمال کے ساتھ



محو تصور رخ جاناں رہا کرو
یعنی حریفِ گردشِ دوراں رہا کرو

محسوس ہو گی دوستو! راحت عجیب سی
مانندِ زلفِ یار پریشاں رہا کرو

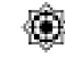
جھومو شجر کی شاخ کی صورت بہار میں
برگِ خزاں کی طرح نہ لرزاں رہا کرو

اپنا یہ عکس بارہا دیکھا ہوا تو ہے
مت آئنے کے سامنے حیراں رہا کرو

ہر لمحہ نوکِ خار پہ کرتے رہو بسر
ہر آن رشکِ سنبل و ریحاں رہا کرو

چھننے کا کوئی خوف نہ کھونے کا کوئی غم
اچھا یہی ہے بے سرو ساماں رہا کرو

اپنی صدا بھی اجنبی ٹھہرے نہ ایک دن
خود سے سحرؔ نہ اتنا گریزاں رہا کرو



دل و نظر کا ذخیرہ تلاش کرتے ہیں
چلو ہم اک نئی دنیا تلاش کرتے ہیں

کہیں ملے نہ ملے ہم کو منزلوں کا سراغ
سفر کے واسطے رستا تلاش کرتے ہیں

نظر نہ آئے جنہیں اپنی آنکھ کا شہتیر
وہ میری آنکھ کا تنکا تلاش کرتے ہیں

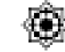
ہمارے سر پہ بڑی تیز دھوپ ہے یارو !
کسی کی زلف کا سایہ تلاش کرتے ہیں

ڈبونا چاہتے ہیں ان کی ذات میں خود کو
سمندروں کو جو دریا تلاش کرتے ہیں

کہیں ہماری نگاہوں نے کھو دیا جس کو
ہم آئنے میں وہ چہرہ تلاش کرتے ہیں

ہماری آنکھ سے بہتے یہ نور کے دھارے
چراغ و اشک میں رشتہ تلاش کرتے ہیں

گزرنے والے گزر بھی گئے سحر لیکن
ہم ان کا نقشِ کفِ پا تلاش کرتے ہیں



جو لوگ اپنی طبیعت کی رو میں رہتے ہیں
سدا وہ کیفیتِ نَو بہ نَو میں رہتے ہیں

کسی کی یاد کے ہالے میں آئے ہیں جب سے
عجیب روشنیوں کے جلو میں رہتے ہیں

جسے ہوائے زمانہ کا کوئی خوف نہیں
ہم اُس چراغِ فروزاں کی لو میں رہتے ہیں

جنہیں عزیز ہمیشہ ہے تازگی فن کی
تلاشِ ذائقۂ حرفِ نو میں رہتے ہیں

سحر ہمارا اندھیروں سے کیا تعلق ہے
ہم آفتابِ محبت کی ضو میں رہتے ہیں



جمالِ شہرِ تمنا پکارتا ہے مجھے
کوئی تو خواب ادھورا پکارتا ہے مجھے

غمِ حبیب جو اپنی طرف بلاتا ہے
تو ساتھ ہی غمِ دُنیا پکارتا ہے مجھے

ہزار چہروں کے بیشک رہوں میں نرغے میں
سدا بس ایک ہی چہرہ پکارتا ہے مجھے

غموں کی دھوپ کڑکتی ہے جب مرے سر پر
کسی کی زلف کا سایا پکارتا ہے مجھے

رہوں جو دشت میں رہ رہ کے گھر بلاتا ہے
چلوں جو گھر کو تو صحرا پکارتا ہے مجھے

میں موج موج بھنور میں اگر ہوں آسودہ
تو کیوں یہ ساحلِ دریا پکارتا ہے مجھے

میں گامزن تو رہوں اپنے راستے پہ سحر
کسی کا نقشِ کفِ پا پکارتا ہے مجھے



ہر ایک شاخ و گل و برگ و بار سے آگے
میں سوچتا ہوں خزاں اور بہار سے آگے

چلے چلو اسی رستے پہ قافلے والو !
دکھائی دیتی ہے منزل غبار سے آگے

نہ تیرگی سے کبھی اس قدر ہراساں ہو
طلوعِ صبح ہے شب کے حصار سے آگے

ہر ایک چاک کا آخر رفو مقدر ہے
میں دیکھتا ہوں گریباں کے تار سے آگے

شکست سے کبھی اتنا نہ دل شکستہ ہو
ملے گا فتح کا مژدہ بھی ہار سے آگے

ملائمت ہے گلوں کی مرے تصور میں
سحر ہر اک خلشِ نوکِ خار سے آگے



سلگ رہے تھے قدم سائبان کیا کرتا؟
زمیں ہی اپنی نہ تھی آسمان کیا کرتا ؟

تھے سونے والے سبھی گہری نیند میں ڈوبے
میں شہرِ خواب میں دے کر اذان کیا کرتا؟

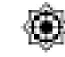
یہ کیا کیا؟ کہ مرے سارے تیر توڑ دیئے
میں لے کے ہاتھ میں خالی کمان کیا کرتا؟

میں اپنی ذات کی تھا سادگی میں مست ایسا
کسی کی بخشی ہوئی آن بان کیا کرتا؟

جہاں ہواؤں سے تھی ناخداؤں کی سازش
وہاں بھنور میں فقط بادبان کیا کرتا؟

بجا گلہ ہے ترا میں جو تجھ کو بھول گیا
مگر میں اسکے سوا میری جان ! کیا کرتا؟

وہاں تو جتنی زبانیں تھیں اتنے قصے تھے
سنا کے اپنی سحرؔ داستان کیا کرتا؟



کلیوں کے چٹکنے میں ابھی دیر لگے گی
گلشن کے مہکنے میں ابھی دیر لگے گی

سینے میں سلگتے ہیں محبت کے شرارے
یہ آگ دہکنے میں ابھی دیر لگے گی

فی الحال تو ہر سمت دھواں سا ہے نظر میں
شعلوں کے بھڑکنے میں ابھی دیر لگے گی

ہے چاروں طرف شب کی سیاہی کا نظارہ
سورج کے چمکنے میں ابھی دیر لگے گی

آتی ہی نہیں یاد مجھے کوئی بھی نیکی
پتھر کے سرکنے میں ابھی دیر لگے گی

ہے خاک مری درد کی بھٹی میں پگھلتی
یہ چاند دمکنے میں ابھی دیر لگے گی

اک جام ابھی بادہ عرفاں کا پیا ہے
رندوں کو بہکنے میں ابھی دیر لگے گی

مشکل سے سحر آئے ہیں ہم راہ یقیں پر
قدموں کو بھٹکنے میں ابھی دیر لگے گی



موسم کے بدلنے میں بہت وقت لگے گا
یہ برف پگھلنے میں بہت وقت لگے گا

فی الحال تو نشہ ہے بہت جاہ و حشم کا
اس دھوپ کے ڈھلنے میں بہت وقت لگے گا

ماحول پہ چھایا ہے گھٹا ٹوپ اندھیرا
سورج کے نکلنے میں بہت وقت لگے گا

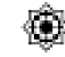
جو گردشِ ایام کی آندھی سے بجھی ہیں
ان شمعوں کے جلنے میں بہت وقت لگے گا

جس رہ پہ قدم اپنے کبھی جم نہیں پائے
اس راہ پہ چلنے میں بہت وقت لگے گا

ہم جھوٹ کے عادی ہیں تو سچ کیسے سنیں گے؟
یہ زہر نگلنے میں بہت وقت لگے گا

ہم لوگ ثریا کی بلندی سے گرے ہیں
اب ہم کو سنبھلنے میں بہت وقت لگے گا

اب تک یہ سحر شدتِ غم کے ہے اثر میں
اس دل کے بہلنے میں بہت وقت لگے گا



سرِ آفاق یہ پھٹتی ہوئی پومت دیکھو
اصل میں ہے یہ ستاروں ہی کی ضومت دیکھو

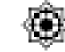
سب سے پہلے یہی گل ہوں گے ہوا کے آگے
ان چراغوں کی بھڑکتی ہوئی لو مت دیکھو

عشق میں دولتِ جاں جتنی لٹاؤ کم ہے
کام سر آتے ہیں دس بیس کہ سو مت دیکھو

آخرکار مقدر کا لکھا بھی کچھ ہے
جو بھی کرتے ہو مسلسل تگ و دو مت دیکھو

تہہِ گرداب سکوں کا ہے عجب نظارہ
سطحِ دریا پہ جو موجوں کی ہے رو مت دیکھو

اصل شے فن میں تحیر ہے تو ہے موضوعِ سخن
کوئی اندازِ کہن ہو کہ ہو نو مت دیکھو



جل جاتے ہیں چپ چاپ زباں ہی نہیں رکھتے
ہم ایسے دئے ہیں کہ دھواں ہی نہیں رکھتے

ہو جو بھی شکایت وہ بیاں کھل کے ہو لیکن
یہ اذن انہیں ہے جو زباں ہی نہیں رکھتے

بیشک ہمیں یہ گردشِ ایام مٹا دے
ہم وہ ہیں کہ احساسِ زیاں ہی نہیں رکھتے

کیسے نہ بہار ان کے بھلا ناز اٹھائے؟
وہ پھول کہ جو خوفِ خزاں ہی نہیں رکھتے

اڑ جائے سحر خاک بھی گر اپنی تو کیا ہے؟
ہم لوگ کوئی نام و نشاں ہی نہیں رکھتے



یوں انا سے چور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !
خود سے بھی ہم دور ہوتے جا رہے ہیں دوستو!

چھو لیا ہے جب سے ان کے پاؤں کی تنویر کو
سنگ ریزے طور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !

ہاتھ کیا آئی ہمیں مشعل کسی کی یاد کی
سب اندھیرے دور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !

ترکِ الفت پر فقط اصرار ان کا ہی نہیں
ہم بھی کچھ مجبور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !

جو لگے ہیں دل پہ اپنوں کی زباں کے تیر سے
زخم وہ ناسور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !

یوں تو بڑھتی جا رہی ہے خوب چہروں کی چمک
دل مگر بے نور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !

خلوتوں کی چار دیواری میں ہم شام و سحر
دم بہ دم محصور ہوتے جا رہے ہیں دوستو !



اسیر گردشِ حالات ہو بھی سکتی ہے
حصارِ غم میں مری ذات ہو بھی سکتی ہے

یقیں نہ آئے تو دیکھو ہماری آنکھوں کو
بغیر ابر کے برسات ہو بھی سکتی ہے

نگاہ و دل کے دریچے کبھی نہ بند کرو
اچانک ان سے ملاقات ہو بھی سکتی ہے

ہمیشہ فتح کے نشے میں رہنا ٹھیک نہیں
کھلاڑیوں کو کبھی مات ہو بھی سکتی ہے

جہاں سحر کے اُجالوں کی حکمرانی ہو
وہاں سیاہ گھنی رات ہو بھی سکتی ہے



کوئی قامت بڑھانے سے قدآور ہو نہیں سکتا
شجر دو چار شاخوں سے تناور ہو نہیں سکتا

جہاں میں اور ہی ہوتا ہے کچھ معیارِ عزت کا
کہ ہر مشہور ہرگز نام آور ہو نہیں سکتا

سمندر کی تہوں سے ہر کس و ناکس نہیں واقف
کوئی موجوں کو چھونے سے شناور ہو نہیں سکتا

چمک میں کوئی ذرہ جس قدر بھی چاہے بڑھ جائے
کبھی ہم پایۂ خورشیدِ خاور ہو نہیں سکتا

فقط اک سنگِ در اپنی تمناؤں کا ہے مرکز
یہ دل ہر آستانے پر نچھاور ہو نہیں سکتا

اگر دل میں شجاعت اور ہمت کا نہیں جوہر
قوی جتنا بھی ہو کوئی دلاور ہو نہیں سکتا

سحر میرے مخالف کا مخالف جو نہیں ہرگز
وہ ہو سکتا ہے سب کچھ میرا یاور ہو نہیں سکتا



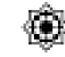
آوازوں کے شور میں اپنے دل کی بھی آواز سنو!
کیا کہتا ہے چپکے چپکے روح کا دھیما ساز سنو!

وقت کے ہفت افلاک کی اونچی اور بے انت فضاؤں میں
ایک اک اڑتا لمحہ کیسے ہے محوِ پرواز سنو!

ساحل پر آتی جاتی موجوں کے شور کو مت دیکھو
بیچ بھنور کیسا موجوں کے رقص کا ہے انداز سنو!

سننے کو تو مل جائیں گی رنگ برنگی آوازیں
لیکن ہر آواز میں پنہاں رنگ کا کیا ہے راز سنو!

اک جیسا انجام سحر ہے ساری ہی آوازوں کا
خاموشی کی حد پر کیا آواز کا ہے آغاز سنو!



رنگت گلوں کی بوئے صبا ہے نئی نئی
باغِ جنوں کی آب و ہوا ہے نئی نئی

ہم جیسے شب زدوں کو ہو پہچان کس طرح؟
سورج کی آسماں پہ ضیا ہے نئی نئی

ملنے کے بعد آپ سے محسوس یوں ہواً
سانسوں میں زندگی کی ادا ہے نئی نئی

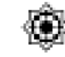
مانوس ہو ہی جائیں گے کچھ دیر بعد ہم
بستی نئی نئی ہے فضا ہے نئی نئی

سوغات کیسے ہم نہ یہ رکھیں سنبھال کے
اسکی طرف سے غم کی عطا ہے نئی نئی

اک خامشی سی چاروں طرف ہے جواب میں
دشتِ وفا میں میری صدا ہے نئی نئی

کچھ دیر تو لگے گی سنبھلنے میں دوستو!
اس راہ میں یہ لغزشِ پا ہے نئی نئی

میرے لئے ہے لذتِ غم اجنبی ابھی
سر پر مرے سحر یہ ردا ہے نئی نئی



کوئی جی بھر کے رونے کا بہانہ چاہئے مجھ کو
جہاں سر رکھ سکوں میں ایسا شانہ چاہئے مجھ کو

میں دنیا کی سمجھ میں آ نہیں سکتا بآسانی
سمجھنے کے لئے بھی اک زمانہ چاہئے مجھ کو

فسانے سے بھی گرچہ رنگ ہے دلکش حقیقت کا
حقیقت سے جو بڑھ کر ہو فسانہ چاہئے مجھ کو

بلندی پر ہوں گرچہ عالمِ پرواز میں ہر دم
نگاہوں میں مگر اک آشیانہ چاہئے مجھ کو

تڑپتے ہیں جو پیشانی میں میری ایک مدت سے
انہی سجدوں کی خاطر آستانہ چاہئے مجھ کو

سحر لعل و جواہر کی نہیں خواہش مجھے ہرگز
چھپا ہے میرے اندر جو خزانہ چاہئے مجھ کو



دھوپ کے عالم میں سایوں کی طرح
آدمی ہیں کچھ درختوں کی طرح

لوٹ کر واپس کبھی آتے نہیں
لمحے اڑتے ہیں پرندوں کی طرح

آندھیوں کو خوف ہے تو ہم سے ہے
ہم جو ہیں بجھتے چراغوں کی طرح

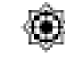
گونجتے ہیں گنبدِ احساس میں
روح کے نغمے اذانوں کی طرح

خوشبوئیں اس کا پتہ دیتی ہیں صاف
وہ گزرتا ہے ہواؤں کی طرح

کیا ضروری ہے کہ وہ زندہ بھی ہوں
سانس جو لیتے ہیں زندوں کی طرح

کسقدر نازک ہیں پیکر خواب کے
ٹوٹ جاتے ہیں جو شیشوں کی طرح

تشنگی لائی وہاں ہم کو سحر
ہے جہاں دریا سرابوں کی طرح



مری تصویر کیا سارا ہی پس منظر کسی کا ہے
یہ جو بھی عکس ہے آئینے کے اندر کسی کا ہے

جو لہراتا ہوا آیا ہے یوں میری طرف یارو!
نہیں ہے کوئی ہرگز پھول وہ پتھر کسی کا ہے

عجب بام و در و دیوار میں ہے اجنبیت سی
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا گھر کسی کا ہے

تصور میں اُسی کے رات دن ڈوبا ہوا ہوں میں
خیالوں پر مرے چھایا ہوا پیکر کسی کا ہے

بجھاؤں پیاس میں کس طرح اپنے تشنہ ہونٹوں کی
لبالب ہے جو میرے ہاتھ میں ساغر کسی کا ہے

عدو سے جنگ میں ہرگز نہیں ہے دل مرا شامل
میں جس کے واسطے لڑتا ہوں وہ لشکر کسی کا ہے

کہاں تک میں فضاؤں کی بلندی پر ہوں اُڑ سکتا
کہ جس پر ناز کرتا ہوں میں وہ شہپر کسی کا ہے

سحر کیسے بھلا میں ملکیت اپنی کہوں اس کو
صدف ہے میری مُٹھی میں مگر گوہر کسی کا ہے

دیوار کوئی اور ہے، در اور طرح کا
ہم رہتے ہیں جس میں وہ ہے گھر اور طرح کا

اوپر سے ہے ٹھہرا ہوا خاموش سمندر
لیکن ہے تہِ آب بھنور اور طرح کا

منزل کا تعیّن ہے نہ رستہ ہے نظر میں
درپیش ہے اب کے یہ سفر اور طرح کا

رہتا ہے ہمیشہ مرا اک پاؤں وطن میں
دنیا میں ہوں میں شہر بدر اور طرح کا

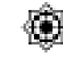
بے خوف ہوں آئندہ و موجود سے یکسر
ہے ذہن پہ چھایا ہوا ڈر اور طرح کا

ہر خاک بسر کی نہیں قسمت میں بلندی
نیزے پہ چڑھا کرتا ہے سر اور طرح کا

کہتے ہیں کہ ہوتا ہے صلہ صبر کا شیریں
ہم کو تو ملا ہے یہ ثمر اور طرح کا

کس طرح زمانے سے بھلا میری بنے گی؟
میرا ہے جو اندازِ نظر اور طرح کا

ظلمت بھی نہیں اور اُجالا بھی نہیں ہے
نظارہ ہے اک شام و سحر اور طرح کا



ہوائے تازہ بھی ممکن دھواں بھی ممکن ہے
چمن میں موسمِ گل بھی خزاں بھی ممکن ہے

ردائے خاک اگر ہے ہمارے سر پہ تنی
ہمارے زیرِ قدم آسماں بھی ممکن ہے

بلندیوں کے مقدر میں پستیاں ہیں اگر
تو پھر زمیں پہ کوئی کہکشاں بھی ممکن ہے

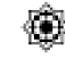
وفا کی راہ میں یارو ! سنبھل سنبھل کے چلو
کہ اس دیار میں جاں کا زیاں بھی ممکن ہے

ہجومِ غم میں کسی یاد کا بھی ہے امکاں
کڑکتی دھوپ میں اک سائباں بھی ممکن ہے

فسانہ ہائے کہن ہیں جو آج بھی زندہ
محبتوں کی نئی داستاں بھی ممکن ہے

اگر عدو بھی مرے حق میں بول سکتے ہیں
مرے خلاف مرا ہی بیاں بھی ممکن ہے

امید وبیم کے ہم ہیں عجب دوراہے پر
سحر یقیں بھی ہے ممکن گماں بھی ممکن ہے



دیکھتے ہیں شہر میں جب بزم آرائی بہت
دل کو ہوتی ہے وہیں محسوس تنہائی بہت

گردشِ دوراں کسی کی یاد دھندلاتی رہی
پانیوں پر مدتوں جمتی رہی کائی بہت

راستوں کے پیچ و خم نے اس کو پہچانا نہیں
جس مسافر کی تھی منزل سے شناسائی بہت

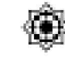
واقعے ایسے بھی گزرے ہیں نظر کے سامنے
آدمیت دیکھ کر جن کو ہے شرمائی بہت

حسن کا نظارہ آنکھوں کے لئے ہے تازگی
چاند کو دیکھیں تو بڑھ جاتی ہے بینائی بہت

چاہتے ہیں ہم تو آئینے میں ہو بس ایک عکس
کیا کریں لیکن ہمارا دل ہے ہر جائی بہت

تھا دلوں کے درمیاں شاید جدائی کا سماں
دیر تک روتی رہی کل رات شہنائی بہت

پھول سے بڑھ کر سحر راہِ وفا کا خار ہے
لطف دیتی ہے ہمیں یہ آبلہ پائی بہت



چلے جو تیر اندھیرے میں کمانوں تک نہیں آئے
شکایت ہو بھلا پھر کیوں نشانوں تک نہیں آئے

فضاؤں کی فلک پیما بلندی لے گئی ان کو
پرندے جا کے واپس آشیانوں تک نہیں آئے

کشش کچھ بڑھ کے تھی شاید کسی انجانی منزل کی
مسافر لوٹ کر اپنے ٹھکانوں تک نہیں آئے

ابھی آنکھوں ہی آنکھوں میں ہے دل کا راز پوشیدہ
ابھی قصے یہ لوگوں کی زبانوں تک نہیں آئے

ہماری خاک کو بھی خود ضرورت چاندنی کی تھی
زمیں کے چاند تھے ہم آسمانوں تک نہیں آئے

دوبارہ پھر کسی کو عزت و عظمت نہیں ملتی
کٹے اک مرتبہ جو سر وہ شانوں تک نہیں آئے

ابھی ہم لوگ ماضی کے طلسمِ خواب میں گم ہیں
ابھی جاگے ہیں آئندہ زمانوں تک نہیں آئے

ہمیں اپنی ہی دہلیزِ محبت سے نہیں فرصت
تعجب کیا جو چل کر آستانوں تک نہیں آئے

کڑکتی دھوپ میں لذت تھی ان کے واسطے کیسی
جو سائے کی طلب میں سائبانوں تک نہیں آئے

کمی کیا ہے سحر دل میں وفا کے لعل و گوہر کی
کبھی ہم اٹھ کے اپنے ہی خزانوں تک نہیں آئے